بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

مسلمان دنیا کے کسی حصے اور گوشے میں ہو، عالم عرب سے اس کو ایک جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، سرزمین عرب میں اگر کوئی حادثہ رونما ہو جائے یا کوئی ناخوش گوار بات پیش آجائے، تو دنیا کے ہر خطے کا مسلمان اپنے دل میں اس کی تکلیف اور کسک محسوس کرتا ہے، اور کوئی خوشگوار اور مسرت آمیز خبر معلوم ہو تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اس جذباتی اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے عالم عرب کے موجودہ سیاسی حالات، غیر یقینی صورت حال، اور عرب ممالک اور ریاستوں کے باہمی اختلافات سے دنیا کے مسلمانوں کا متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ خلیجی ممالک میں جو موجودہ بحران پیدا ہوا ہے، اس سے ہر جگہ اور ہر سطح پر تشویش اور بے چینی پائی جاتی ہے، خواص تو خواص عوام بھی ان حالات سے فکرمند اور افسردہ خاطر ہیں۔

مسلمانوں کی یہ فکرمندی بے جا اور بے محل بھی نہیں ہے، گزشتہ چند سالوں سے عرب ممالک جن حالات سے نبرد آزما ہیں، اور کئی طاقتور ملکوں کی جس طرح اینٹ سے اینٹ بجا کر ان کو تباہ و برباد اور تاخت و تاراج کر دیا گیا ہے، وہاں کا امن وامان پارہ پارہ اور شیرازہ منتشر کر دیا گیا ہے، حکومتوں اور حکمراں جماعتوں کو مغربی دنیا کے ہاتھوں میں یرغمال بنا دیا گیا ہے، وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے، اس کے پیچھے گہری سازش کارفرما ہے، کہ عرب ممالک کو آپس میں لڑا کر، ان کے اندر خانہ جنگی پیدا کر کے، ان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر، اور پورے خطے میں جنگ اور باہمی کشمکش کے حالات پیدا کر کے سیاسی، معاشی اور اقتصادی فائدہ اٹھایا جائے، اس کا استحصال کیا جائے، اور علاقے کی پوری دولت وثروت پر اپنا کنٹرول رکھا جائے، اور ریموٹ کنٹرول وہاں سے کہیں بہت دور سیاسی آقاؤں کے ہاتھوں میں رہے۔

عراق وشام وغیرہ کی بربادی کے بعد سعودی عرب، مصر، متحدہ عرب امارات اور بحرین کے قطر کا مقاطعہ اور ناکہ بندی سے کون شخص ہوگا، جس کو فکر وتشویش نہیں لاحق ہوگی، اور کون ایسا مسلمان ہوگا جو ان ممالک کی سلامتی، اور ان کے باہمی اختلافات کے پرامن حل کے لیے دعا گو نہیں ہوگا، یہ بات بالکل ظاہر ہے جس سے کسی کو ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں ہوسکتا کہ ان ممالک کی آپس کی اس کشیدگی سے نقصان صرف اور صرف اسلام اور مسلمانوں کا ہوگا، اور فائدہ صرف اور صرف ان طاقتوں کو ہوگا جو اسلام اور مسلمانوں کی بدترین دشمن ہیں، جن کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ اسلام کا وجود ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے، جو اسلام، عالم اسلام اور مسلمانوں کو کمزور اور بے دست و پا کرنے کے لیے ہمہ وقت سازشوں کے جال بنتی رہتی ہیں، اس لیے مسلمانوں کی یہ دیرینہ تمنا وآرزو اور خالق کائنات کی بارگاہ میں الحاح وزاری کے ساتھ دعا ہونی چاہئے کہ عربوں کا اختلاف ورسہ کشی اتحاد واتفاق، ہم آہنگی اور محبت واخوت میں تبدیل ہوجائے، جو خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔

موجودہ دنیا کے اندر جو مسلم ممالک ہیں، وہ اگر باہم متحد ہوجائیں، تو دنیا کے اندر مسلمانوں کے ساتھ جو جارحیت ہورہی ہے، اور ان کے اوپر ظلم وبربریت کے جو پہاڑ توڑے جارہے ہیں، اگر ان کا یکسر خاتمہ اور قلع قمع نہ بھی ہوسکے گا، تب بھی بہت حد تک کمی واقع ہوجائے گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے عوام پوری طرح بے چین ہوجاتے ہیں، لیکن مسلم حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ وہ چوں تک نہیں کرتے۔ گزشتہ چند مہینوں میں برما کے روہنگیا مسلمانوں پر کون سی ایسی قیامت ہے جو نہیں گزری، ہزاروں تہ تیغ کیے گئے، لاکھوں افراد ترک وطن پر مجبور ہوئے، بے شمار عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے، نہ جانے کتنی بڑی تعداد میں مسلم خواتین کی عفت وعصمت کی چادر کو تار تار اور عزت وناموس کو پامال کیا گیا، ان کے ساتھ دنیا کی سب سے ''امن پسند'' بودھ قوم نے درندگی اور بربریت کا جو مظاہرہ کیا ہے، اس نے تاریخوں میں درج ظلم وستم کی داستانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، ان کے ظلم وبربریت سے سخت سے سخت دل بھی کانپ اٹھے ہیں، نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم عوام نے ان مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیے ہیں، لیکن مسلم حکمرانوں نے یا تو ان کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا، یا اگر لیا بھی تو بڑی بے دلی کے ساتھ اور صرف رسمی طور پر۔

برما میں جو کچھ ہوا ہے وہ منظّم سرکاری دہشت گردی سے کم نہیں ہے، اتنے بڑے پیمانے پر نسل کشی کی مثال موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں شاید ہی ملے، لیکن کسی نے بھی اس کی دہشت گردی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا، تمام ممالک یا تو خاموش تماشائی بنے رہے، یا گیدڑ بھبھکی سے کام چلاتے رہے، حالانکہ فوجی قوت کے لحاظ سے برما کی کوئی اوقات نہیں ہے، لیکن چونکہ ظلم وبربریت کا شکار زیادہ تر مسلمان تھے اس لیے اس سے کسی نے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

برمی مسلمانوں کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں، قتل وغارت گری کے بعد اب جو خبریں آرہی ہیں، وہ ان مسلم خواتین کے جسمانی استحصال کی ہیں، جو بالکل بے بس، بے سہارا اور بے یارومددگار ہیں۔ برمی عوام اور فوجیوں کی درندگی کا جو شکار ہوئی ہیں، صرف ان ہی کی بات نہیں ہے، اخباری اطلاعات سے معلوم ہورہا ہے کہ دوسرے ملکوں کے پناہ گزیں کیمپوں میں جو عورتیں پناہ لیے ہوئے ہیں، وہ بھی وہاں کے بھیڑیا صفت انسانوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان مظلوم وبے سہارا لوگوں کی مدد فرمائے، اور ان کی حفاظت کا اپنی قدرت سے بہترین انتظام فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

صفحہ ۴۱ کا بقیہ

کارثواب نہیں ہے؟ اگر ثواب سمجھ کر کرنے سے کام بدعت بن جائے گا، اس وجہ سے اس سے احتراز کرنا چاہیے، تو پھر کیا سمجھ کر کرنا چاہیے؟ کیا حدیث سے ثابت ہونے کے باوجود اس کام کو بالکل ترک کردینا چاہیے؟ حیرت ہے کہ حدیث سے یہ مضمون ثابت ہونے کے باوجود کہ دسویں محرم کو جو شخص اپنے اہل وعیال کے کھانے پینے میں کشادگی سے کام لے، اس پر پورے سال کشادگی ہوگی، اگر کوئی شخص حدیث پر عمل کا ثواب حاصل کرنے کے لیے یہ کام کرے تو عمل سے تو نہیں ہوگا لیکن ثواب سمجھنے سے بدعت کا مرتکب ہوجائے گا!!۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۃ البروج

مشہود کی مختلف صورتیں:

(۱) اچھے یا برے اعمال جو قبروں سے اٹھتے ہی ساتھ ہوں گے۔

(۲) فرشتے جو طرح طرح کے آرام پہنچانے اور عذاب دینے کے لیے لوگوں کے ساتھ ہوں گے، اور ساتوں آسمان، عرش کے حاملین، اور اعمال لکھنے والے تمام فرشتے اس دن لوگوں کو سرِ عام نظر آئیں گے۔

(۳) اعمال نامے، جو ہر شخص کو دیے جائیں گے تاکہ وہ مطالعہ کرے۔

(۴) وزنِ اعمال، جو تولتے وقت واضح ہو جائے گا۔

(۵) تجلّیِ الٰہی، جو اس دن کی حاکم ہے، بے حجاب جلوہ افروز ہوگی۔

(۶) جنت اور دوزخ، جو اس جہاں میں نظروں سے اوجھل ہیں، اس دن جنت آرائش کی تمام جلوہ سامانیوں کے لباس میں ظاہر ہوگی اور دوزخ اپنے تمام تر عذاب وشدائد اور خوفناک منظر کے ساتھ ظاہر ہوگی۔

ان چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے انسان کے اندر بلکہ پورے عالم کے اندر ایک عجیب انقلاب برپا ہوگا۔

شاھدٍ وَّمشھود کی تفسیر میں مختلف اقوال:

شاھدٍ وَّمشھود کی تفسیر میں بہت اختلاف ہے، ہم نے جو تفسیر ذکر کی ہے یہ صحابۂ کرام (و) دیگر معتبر مفسرین کا قول ہے، جیسے حضرت ابنِ عباس، حضرت حسن، ضحاک، مجاہد اور ابن مسیّب رضی اللہ عنہم

دوسرا قول: لیکن تفسیر معالم التنزیل میں بغوی سے، اور دوسری کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''شاہد'' سے مراد جمعہ کا دن ہے، اس دن ہر شہر اور

مسجد میں جہاں جمعہ پڑھا جاتا ہے برکتیں نازل ہوتی ہیں اور ''مشھوذ'' سے مراد عرفہ کا دن ہے، حاجی لوگ دور دراز کے ملکوں سے سفر کر کے حج کے انوار حاصل کرنے کے لیے اس دن ایک خاص جگہ (میدانِ عرفات) میں جمع ہوتے ہیں گویا وہ دن اس خاص جگہ میں رہتا ہے اور لوگ اس کے شوق میں اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ (اس لیے اس کو مشہود کہا گیا)

شاهدٍ وَّ مشهود کونکرہ لانے کی وجہ:

شاهدٍ وّمشهود سے پہلے کی قسمیں معرف باللام ہیں اور شاہد ومشہود کو نکرہ لایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ اور عرفہ کا دن کسی ایک خاص فرد میں منحصر نہیں ہے، یہ دن بار بار آتا ہے، اس کے مقابلے میں آسمان، بُروج، اور قیامت متعین اور غیر مکرر دن ہیں۔

جمعہ وعرفہ کے فضائل:

حدیث میں آتا ہے ''**خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة فيه خلق آدم، وفيه أدخل الجنة، وفيه أهبط منها، وفيه تقوم الساعة، وفيه تاب الله على ادم**''

یعنی جس دن میں سورج طلوع ہوتا ہے اس میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم کو پیدا کیا گیا اسی میں ان کو جنت میں داخل کیا گیا، اسی میں ان کو زمین پر اتارا گیا، اسی میں قیامت قائم ہوگی، اور اسی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی توبہ قبول فرمائی۔

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں بندہ جو بھی اللہ سے دعاء کرے ضرور قبول ہوتی ہے، ایک اور حدیث میں آتا ہے:

''**أكثروا الصلوٰة عليّ يوم الجمعة**'' ''جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو''

حدیث میں آتا ہے اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن فرشتوں سے فرماتے ہیں میرے بندوں کو دیکھو کیسے گرد وغبار سے آلودہ اور بکھرے بالوں میں کتنی دور دور سے میرے گھر کا حج کرنے آئے ہیں، تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔

عرفہ کے دن شیطان اللہ تعالیٰ کی عام مغفرت کو دیکھ کر چیختا ہے اور سر پر مٹی ڈالتا ہے۔

اس دن کا روزہ دو سال گذشتہ اور دو سال آئندہ کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔

یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہفتے میں بہترین دن جمعہ کا ہے اور سال کے دنوں میں

بہترین دن عرفے کا ہے، اور اگر دونوں جمع ہو جائیں تو نورٌ علی نورٌ ہے۔

ان دونوں دنوں میں بھی ایک طرح کا انقلاب ہے کہ ہماری شریعت میں جمعہ ہفتے کی ابتداء ہے اور عرفہ کا دن سال کی عبادتوں کی انتہاء ہے۔ اس لیے کہ اس دن عبادتِ کبریٰ یعنی حج ادا کیا جاتا ہے۔

تیسرا قول: بعض مفسرین نے کہا ہے جس دن میں کوئی عظیم اجتماع ہو، وہ دن مشہود اور اجتماع میں حاضر ہونے والے شاہد ہیں، اس تفسیر کے مطابق جمعہ کا دن، عیدین کے دن، عرفہ اور ترویہ کا دن مشہود ہیں اسی طرح ہر اجتماع کا دن مشہود ہے، اور حاضرین شاہد ہیں۔

چوتھا قول: بعض مفسرین نے مشہود و شاہد کو شہود سے نہیں لیا جس کا معنی حاضر ہونا ہے، بلکہ شہادۃ سے لیا ہے جس کے معنی گواہی کے ہیں، اس لحاظ سے شاہد اور مشہود بہت سی چیزیں ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) شاہد حق تعالیٰ ہیں اور مشہود مخلوق ہے یہی حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ قرآن میں ہے، ''**و کفی باللّٰه شهیداً**''

(۲) حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا شاہد اللہ تعالیٰ ہے اور مشہود بہٖ توحید ہے (گویا مشہود سے مراد مشہود بہٖ ہے) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''**شهد اللّٰه أنه لا إله إلا هو**''

(۳) شاہد اللہ کے پیغمبر ہیں اور مشہود علیہ ہر پیغمبر کی امت ہے، جس کی دلیل یہ ارشاد ہے ''**فکیف إذا جئنا من کل اُمةٍ بشهید**'' (گویا مشہود کا صلہ علیہ محذوف ہے)

(۴) شاہد اعمال لکھنے والے فرشتے اور مشہود مکلفین ہیں اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ''**وجاء ت کل نفس معها سائق و شهید**''

(۵) شاہد انسان کے اعضاء ہیں اور مشہود علیہ خود انسان ہے اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ''**یوم تشهد علیهم السنتهم و أیدیهم و أرجلهم**''

(۶) شاہد دن اور رات ہیں اور مشہود انسانوں کے اعمال ہیں جیسے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ''**ما من یوم إلا ینادی إنی یوم جدید وإنی علی ما یعمل فيّ شهید**'' (یہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے)

(۷) آسمان وزمین شاہد ہیں اس لیے کہ آسمان کے جس حصے کے نیچے بھی کوئی اچھا یا برا فعل کیا گیا ہے آسمان کا وہ حصہ قیامت کے دن اس پر گواہی دے گا، اور زمین کے جس حصے پر بھی کوئی نیکی یا برائی کی گئی ہے قیامت کے دن زمین کا وہ ٹکڑا اس پر گواہی دے گا۔ اور مشہود بہ وہ کام ہیں اچھے یا برے جو آسمان کے نیچے اور زمین پر کیے جاتے ہیں۔

(۸) شاہد آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مقدس ہے اور مشہود علیہ دوسری امتیں ہیں جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے "**وکذٰلک جعلنا کم امة وسطا لتکونو شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیداً**"

(۹) امامِ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمام ممکنات شاہد ہیں اور حق تعالیٰ کی ذات واجب الوجود مشہود ہے، اس لیے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے وجود پر گواہی دیتا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق اہلِ کلام کی یہ اصطلاح ہے کہ غائب کو حاضر پر قیاس کرنا درست نہیں لیکن حاضر کے ذریعہ غائب پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) شاہد حجرِ اسود ہے، اور حجاج کرام مشہود لہ ہیں، اس لیے کہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

"**الحجر الأسود یمین اللّٰه فی الأرض یجیئ یوم القیامة له عینان یبصر بهما ولسان ینطق به یشهد علی من استلمه بحق**"

(۱۱) حضرات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ "مقام جلاء" میں حق شاہد ہے اور مخلوق مشہود اور "مقام استجلا" میں مخلوق شاہد اور حق مشہود ہے۔

بہر حال یہ جتنی چیزیں ذکر کی گئیں یہ سب عظمت وشرافت کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے، نیز فی الجملہ یہ انقلاب احوال پر بھی دلالت کرتی ہیں، اور بعض معانی کے اعتبار سے ان میں تنکیر وابہام بھی مناسب ہے، (یعنی "**شاهدٍ وَّمشهود**" قرآن میں نکرہ آئے ہیں اگر مذکورہ چیزوں میں سے کسی کو بھی شاہد ومشہود کا مصداق ٹھہرایا جائے تو درست ہے کہ ان چیزوں میں بعض معانی کے اعتبار سے ابہام وتنکیر مراد لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ قسم ایک انقلاب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے سو مذکورہ چیزیں بھی فی الجملہ انقلابِ احوال پر دلالت کرتی ہیں)

جوابِ قسم میں مفسرین کے پانچ اقوال:

جوابِ قسم کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے: (۱) بعض کہتے ہیں کہ "قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ" جوابِ قسم ہے اور "قُتِلَ" سے پہلے "لَقَدْ" مقدر ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ اس کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی یوں ہے "قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ"

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ سے منقول ہے کہ "بطش ربک لشدید" جوابِ قسم ہے اور قسم اور جوابِ قسم کے درمیان جو کلام ہے یہ جملہ معترضہ ہے۔

(۴) صاحب کشاف اور کچھ متقدمین نے کہا ہے کہ جوابِ قسم محذوف ہے اور وہ یہ ہے:

" لعن من يؤذى المؤمنين لإيمانهم كما لعن أصحٰب الأخدود"

(۵) اور اصح یہ ہے کہ جوابِ قسم "إن الذين فتنوا المؤمنين" ہے اور "قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ" کا مضمون اس جوابِ قسم پر بطور شاہد کے ہے۔ اس مضمون کو چار قسموں کے بعد جوابِ قسم سے پہلے درمیان میں اس لیے لائے ہیں تاکہ عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ نقلی دلائل بھی جمع ہوجائیں جس سے مدّعیٰ اور مطلب کا اثبات زیادہ قوت سے ہوگیا ہے۔

قسم سے متعلق دیگر نکات:

نیز ان قسموں سے مطلقاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے ایسا آئے گا جب عالم میں انقلاب برپا ہوگا، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک وعدہ کیے ہوئے دن میں کہ جب شہادت قائم ہوگی اور مشہود بہ کا اظہار ہوگا تب دنیا کے اندر ہی ظالم سے انتقام لے لیا جائے گا۔

(قُتِلَ اَصۡحٰبُ الخ سے جس قصے کی طرف اشارہ ہے) اس قصے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان بندوں کی مدد اللہ کی طرف سے ضرور ہوتی ہے۔

پس اس قصے کا یہاں ذکر کرنا تقریبِ سخن کے لیے ہے، اور تنزیل العام علی الخاص کی قبیل سے ہے (یعنی اس عام قصے سے خاص مسلمانوں کے دشمن مراد ہیں) گویا یوں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں سے دنیا وآخرت میں ضرور انتقام لیا جائے گا، جس وقت کہ گواہیاں قائم ہوجائیں گی اور الزام ثابت ہوجائے گا، جیسا کہ اس سے پہلے بھی دنیا میں یہ واقعہ ہوچکا ہے چنانچہ فرمایا:

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ○

مارے گئے کھائیاں کھودنے والے

یعنی ان خندق والوں کا قتل عام کیا گیا، یہ خندقیں چالیس گز لمبی اور بارہ گز چوڑی کھودی گئی تھیں، تا کہ ان میں مسلمانوں کو ڈال کر عذاب دیں، وہ خندقیں اس قدر گرم ہوئیں کہ:

النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ○

آگ ہے بہت ایندھن والی

یعنی وہ آگ شعلہ والی تھی، یا یہ معنی ہے کہ بہت سی لکڑیوں والی کہ انھیں جلا کر نہایت گرم کیا گیا تھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو فرماتے تھے ''اعوذ باللّٰہ من جھد البلاء'' یہ ظالم خندقوں والے مسلمانوں کو ان خندقوں میں ڈالنے کے بعد مسلمانوں کے انتقام میں اسی آگ کے اندر جلا دیے گئے، گھر تک جانے کی بھی فرصت نہ ملی، یہ بہت جلد اور فوری انتقام تھا جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا لیا اور یہ انتقام اس وقت لیا گیا کہ وہ ظالم لوگ وہیں بیٹھے تھے۔

اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ○

جب وہ اُس پر بیٹھے

یعنی وہ لوگ آگ کی ان خندقوں کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے، اسی حال میں اس آگ نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سب جل کر خاکستر ہو گئے، تھوڑی سے مہلت وفرصت بھی ان کو نہ ملی۔

اس طرح کا جلد اور فوری انتقام عوام کی نظروں میں عبرت کا سامان ہوا کرتا ہے اور حقیقت میں بھی ان ظالموں نے ظلم کی بھی حد کر دی تھی، اس لیے کہ عام طور پر ظالم خود اپنے سامنے ظلم نہیں کرتے اپنے کارندوں کے ذریعہ کراتے ہیں یا قید خانے میں قید کروا دیتے ہیں تا کہ خلافِ وقار

ومروت نہ ہو، لیکن انھوں نے تو اپنے سامنے سب کچھ کیا۔

وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝

اور جو کچھ وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے

خندق والوں کے چار قصے:

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان والوں کو ایمان کی وجہ سے آگ کی خندقوں میں جلانے اور جلانے والوں کا خود آگ میں بھسم ہوجانے کے چار قصے ہیں جو چار مختلف مقامات پر واقع ہوئے، اور جن بستیوں میں یہ واقعات ہوئے وہ حجاز سے قریب ہیں، اور یوں معلومہوتا ہے کہ اس آیت میں چاروں ہی مراد ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ اہلِ مکہ ڈریں، عبرت پکڑیں اور مسلمانوں کی ایذا دہی سے باز آئیں۔

پہلا قصہ ملک شام کا:

صحیح مسلم اور دوسری صحاح کی کتب میں وارد ہے حضرت صہیب ؓ سے مروی ہے کہ ملک شام میں ایک عظیم الشان بادشاہ تھا، اس کے ہاں ایک ماہرِ فن جادوگر رہتا تھا، اس بادشاہ کی سلطنت گویا اس کی وجہ سے قائم تھی، اگر کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو جادوگر اپنے جادو سے دشمن کو ہلاک کر دیتا اور بادشاہ کو لڑنے بھڑنے کی نوبت نہ آتی، اور اگر کبھی ارکانِ سلطنت بادشاہ کی نالائق حرکتوں کی وجہ سے برگشتہ ہوجاتے تو وہی جادوگر اپنے جادو کے زور سے ان کو پھر آمادۂ اطاعت کر لیتا تھا، یہاں تک کہ وہ جادوگر بوڑھا ہوگیا، اور زندگی سے ناامید ہوگیا، تب اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں اب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہوں گا، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ہوشیار اور عاقل لڑکا اپنے غلاموں میں سے میرے سپرد کریں جس کو میں جادو سکھا سکوں تاکہ میرے مرنے کے بعد بھی آپ کا کاروبار سلطنت چلتا رہے۔

چنانچہ بادشاہ نے ایک قابل اور ہوشیار لڑکا اپنے غلاموں سے منتخب کر کے جادوگر کے حوالے کیا، اور لڑکے کو حکم دیا کہ صبح سے شام تک روزانہ جادو سیکھا کرو، لڑکے نے جادوگر کے گھر آنا شروع کر دیا اور جادو کا فن حاصل کرنے لگا۔

ایک دن راستے میں آتے ہوئے اس نے دیکھا بہت سے لوگ ایک مکان سے نکل رہے

ہیں اس نے کسی سے پوچھا یہاں کون ہے جس کے پاس اتنے لوگ جاتے ہیں، اس کو بتایا گیا کہ یہاں ایک راہب رہتا ہے جو دنیا ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتا ہے یہ لڑکا بھی اندر چلا گیا راہب کے پاس بیٹھ گیا، راہب کی باتیں سننے لگا، راہب کی باتوں کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اب ہر روز آتے جاتے راہب کے پاس بیٹھنے لگا، رفتہ رفتہ جادوگر سے اس کا دل اچاٹ ہونے لگا اور زیادہ دیر راہب کے پاس بیٹھنے لگا، اور تھوڑے وقت کے لیے جادوگر کے پاس جاتا اس پر جادوگر نہایت غضب ناک ہوتا اسے ڈانٹتا، آخر تنگ آ کر ایک دن جادوگر نے بادشاہ سے کہلا بھیجا کہ لڑکا بہت سستی اور دیر کرتا ہے، بادشاہ نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کی کہ یہ لڑکا صبح سویرے جادوگر کے پاس جایا کرے، اس پر لوگوں نے کہا یہاں سے تو سویرے ہی جاتا ہے، راستے میں کہیں دیر کرتا ہے، یہ بات جب بادشاہ کو معلوم ہوئی تو سمجھا کہ لڑکپن ہے شاید لڑکوں کے ساتھ راستے میں کھیل کود میں دیر کرتا ہے۔ اس لیے بادشاہ اور جادوگر دونوں نے خوب ڈرایا دھمکایا کہ آئندہ دیر کی تو خیر نہ ہوگی۔

ایک دن بادشاہ کے دولت خانے کی طرف آتے ہوئے راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا اژدہا ہے راستہ بند ہے لوگ اِدھر کے اِدھر اور دوسری طرف کے اسی طرف پھنسے ہوئے ہیں لڑکے نے یہ دیکھا تو دل میں کہا کہ آج امتحان کرتا ہوں کہ جادوگر کی صحبت بہتر ہے یا راہب کی چنانچہ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور یوں دعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین جادوگر سے بہتر ہے تو اس اژدہے کو ہلاک کردے اور لوگوں کو اس عذاب سے نجات عطا فرما، یہ کہہ کر اس نے اژدہے پر پتھر پھینکا، اس کا پتھر اژدہے کو لگنا تھا کہ اژدہا وہیں ہلاک ہو گیا، لوگ یہ منظر دیکھ کر پکار اٹھے کہ یہ لڑکا جادوگری میں درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے، ہوتے ہوتے یہ خبر راہب تک بھی جا پہنچی۔

راہب نے ایک دن لڑکے کو تنہائی میں بلایا، اس سے کہا اللہ تعالیٰ نے تمھیں بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے، اور مجھے خوب معلوم ہے کہ تم ایک بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کیے جاؤ گے، خبردار میری اطلاع کسی کو نہ دینا لڑکے نے پختہ عہد کیا کہ کچھ بھی ہو جائے آپ کا نام ظاہر نہیں کروں گا، آپ اطمینان رکھیں۔

راہب کی صحبت اور انجیل مقدس کی تلاوت اور دینِ عیسوی کی اتباع کی برکت سے کہ اس زمانے میں حق اسی دین میں منحصر تھا اللہ تعالیٰ نے اس لڑکے کو ولایتِ عظمیٰ کے مقام پر پہنچایا، یہاں

تک کہ کوڑھی اور مادرزاد اندھے اس کے ہاتھ سے ٹھیک ہو جاتے تھے، جن مریضوں کے علاج سے بڑے بڑے طبیب اور معالج عاجز آجاتے وہ اس لڑکے کی دعاء سے تندرست ہو جاتے۔

اتفاق سے بادشاہ کے ایک خاص درباری مصاحب کی بینائی ختم ہوگئی، اور بادشاہ کی مصاحبت وغیرہ سب کچھ چھوٹ گیا، جب اس نے اس لڑکے کی شہرت سنی تو کچھ ہدیہ نذرانہ لے کر اس لڑکے کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا، مجھ پر بھی توجہ فرمایئے اور مجھے شفا بخشیے، لڑکے نے کہا کہ میں کیا چیز ہوں کہ شفا دوں شفا تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ، بت پرستی چھوڑ دو اور بادشاہ کو پروردگار نہ جانو تو میں اللہ تعالیٰ سے تمھاری شفا کے لیے دعا کروں گا، وہ اندھا اسی مجلس میں ایمان لے آیا، اور اس لڑکے کی دعاء سے فوراً اچھا ہو گیا۔

جب بینائی کے ساتھ دوبارہ یہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ دیکھ کر حیران ہوا اور کہا اتنے بڑے بڑے سرکاری طبیب تمھارا علاج نہ کر سکے تھے۔ یہ کس طرح تم ٹھیک ہو گئے، اس آدمی نے کہا مجھے میرے پرودرگار (پرورش کرنے والا) نے بغیر کسی واسطہ کے خود ہی شفا عطا فرما دی۔

بادشاہ نے کہا، ہَیں۔ میرے سوا تمھارا پروردگار کون ہے؟ مصاحب نے کہا میرا اور تمھارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، جس نے مجھے، تجھے اور ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے، بادشاہ غضب ناک ہو گیا اور اس کو سخت مارنے پیٹنے کا حکم دیا اور کہا کہ بتاؤ تمھیں یہ عقیدہ کس نے سکھایا، جب مار پیٹ حد سے گذر گئی تو اس نے لڑکے کا نام بتا دیا، بادشاہ نے لڑکے کو طلب کیا، لڑکا حاضر کیا گیا، بادشاہ نے لڑکے سے کہا کہ میری پرورش اور جادوگر کی محنت کے فیض سے تم اس مقام پر پہنچے کہ اندھوں کو بینا کرنے لگے ہو، اس مقام تک پہنچ کر ناشکری کرتے ہو کہ میرے علاوہ تمھارا پروردگار کوئی اور ہے؟ لڑکے نے کہا میرا، آپ کا اور ساری مخلوق کا پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور شفا نہ میرے ہاتھ میں ہے اور نہ کسی اور کے ہاتھ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

بادشاہ نے کہا اس لڑکے کو سخت ترین سزائیں دو یہ ساحر سے غائب رہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہیں اور جاتا ہے یہ عقیدہ اس نے وہیں سے سیکھا ہے۔

جادوگر بھی یہ سن کر گرتا پڑتا دربار میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یہ لڑکا بہت عرصے سے میرے پاس نہیں آرہا ہے معلوم نہیں کہاں جاتا ہے، دربار کے لوگوں نے بھی کہا یہاں سے تو روزانہ سویرے چلا

جا تا ہے، بادشاہ نے سخت حکم دیا کہ اسے سخت ترین سزائیں دے کر معلوم کرو کہ یہ کہاں جاتا ہے اور یہ عقیدہ کہاں سے سیکھا ہے؟

شدید ترین تکلیفوں سے بے چین ہو کر لڑکے نے گوشہ نشیں راہب کا نام بتادیا۔

بادشاہ نے اس راہب کو بلا کر آرا اس کے سامنے رکھا اور کہا یا اپنے دین سے پھر جاؤ ورنہ اس آرے سے تم کو چیر دوں گا، راہب نے کہا، میں ہرگز اپنے دینِ حق سے نہیں پھروں گا تمھاری جو مرضی ہے کر ڈالو، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو آرے سے چیر ڈالو، فوراً بادشاہ کے کارندوں نے اس کو آرے سے چیر ڈالا۔

پھر اس مصاحب کو سمجھایا کہ اس دین سے پھر جاؤ، جب وہ بھی نہ مانا تو اس کو بھی ہلاک کر دیا۔

اب بادشاہ لڑکے کی طرف متوجہ ہوا، کہنے لگا تم نے ان دونوں کا انجام دیکھ لیا ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ان دونوں سے بیزاری اختیار کرو اور اس دین کو چھوڑ دو، لڑکے نے انکار کر دیا، تو بادشاہ نے اپنے مصاحبوں کو کہا کہ اس کو فلاں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاؤ، وہاں لے جا کر ایک مرتبہ پھر اس کو دین چھوڑ دینے کا کہنا اگر نہ مانے تو اس چوٹی سے اس کو نیچے گرا دینا تا کہ اس کا ایک ایک انگ پاش پاش ہو جائے۔

وہ لوگ جب اس کو لے کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو اس کو سمجھانے لگے، لڑکے نے دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ ان کے شر سے مجھے بچا، اسی وقت پہاڑ پر شدید زلزلہ آیا وہ سب لوگ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح سلامت واپس آ گیا۔

بادشاہ نے پوچھا جو لوگ تمھارے ساتھ گئے تھے ان کا کیا ہوا، لڑکے نے کہا جس خُدا کا میں نے دین قبول کیا ہے اسی خدا نے ان کی تکلیف سے مجھے بچا لیا، بادشاہ کو اور زیادہ غصہ آیا، اس نے اپنے اور ملازموں کو مامور کیا کہ اس کو ایک کشتی کے اندر بٹھا کر دریا کے اندر لے جاؤ، اگر یہ اپنے دین سے پھر جاتا ہے تو بہتر ورنہ اس کو دریا کے اندر پھینک کر آ جاؤ، چنانچہ یہ لوگ اسے لے کر دریا کے اندر گئے وہاں جا کر دین چھوڑ دینے کی ترغیب دینے لگے، اس نے موقع پر پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے

اللہ مجھے ان کے شر سے بچا، ایک دم سے کشتی الٹ گئی وہ سب لوگ غرق ہوگئے اور یہ لڑکا صحیح سلامت باہر نکل آیا، بادشاہ کے پاس پہنچا اور سارا قصہ سنایا، بادشاہ حیرت میں ڈوب گیا۔ اب لڑکے نے کہا اگر آپ مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے، بادشاہ نے پوچھا وہ کیا؟ لڑکے نے کہا تدبیر یہ ہے کہ اس شہر کے تمام لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کریں، پھر مجھے سولی پر لٹکا کر ایک تیر انداز کو مقرر کریں جو یہ فسون پڑھ کر مجھ پر تیر چلائے بس میں ختم ہوجاؤں گا، وہ فسون یہ ہے:

''**بسم اللّٰہ رب الغلام**'' اللہ کے نام سے جو لڑکے کا رب ہے۔

بادشاہ نے اسی تدبیر پر عمل کیا، جب تیر انداز کا تیر لڑکے کے کنپٹی پر جا کر لگا تو اس نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور با آواز بلند یہ کہا میں نے اپنا مقصد حاصل کرلیا، اور اللہ کے نام پر قربان ہوگیا۔ یہ واقعہ ہونا تھا کہ پورے مجمع میں ایک شور برپا ہوگیا اور سب لوگ پکار پکار کر کہہ رہے تھے ''**اٰمنا برب الغلام، اٰمنا برب الغلام**'' ''ہم ایمان لائے لڑکے کے رب پر، ہم ایمان لائے لڑکے کے رب پر''

یہ منظر دیکھ کر بادشاہ کے درباریوں، اور خواص نے کہا یہ تو بہت بُرا ہوا، تدبیر الٹی پڑ گئی، جس بات کا ڈر تھا، وہی ہوگئی، اب سارے شہر والوں کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ لڑکے کا دین سچا تھا، اس کا رب آپ سے بہت زیادہ طاقت وقدرت والا ہے، جب تک اس کے رب کا نام نہ لیا گیا وہ ہلاک نہ ہوسکا، یہ سن کر بادشاہ سیخ پا ہوگیا، اور اپنی خفت وشرمندگی مٹانے کے لیے جھنجھلا کر کہنے لگا، شہر کے تمام کوچوں، کناروں میں خندقیں کھدواؤ میں ان سب نافرمانوں کو آگ میں جلاؤں گا۔

چنانچہ خندقیں کھودی گئیں، ان میں آگ بھڑکائی گئی اور بادشاہ کے حکم سے ان تمام مسلمانوں کو ڈالا جانے لگا، ان میں ایک عورت کو لایا گیا جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا، خندق کے قریب پہنچ کر وہ گھبرائی اور پیچھے ہٹی، بادشاہ کے ظالم کارندوں نے کہا ذرا ٹھہرو شاید یہ اپنے دین سے باز آجائے، اس کو مہلت دو، اتنے میں اس کا دودھ پیتا بچہ پکار کر بولا اس کی یہ بات سب نے سنی وہ ماں سے کہہ رہا تھا، او میری نادان ماں! یہ کیا کر رہی ہے صبر کر، تو سچے دین پر ہے، اور اللہ کا نام لے کر اس آگ میں داخل ہوجا یہ آگ تیرے لیے گلزار بن جائے گی، یہ سنتے ہی وہ عورت بچے سمیت آگ میں کود پڑی۔

آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، مؤمنین کو نذر آتش کرنے کا تماشا یہ ظالم لوگ کرسیوں پر

بیٹھے دیکھ ہی رہے تھے کہ یکا یک آگ کے شعلے لپکے اور ان تمام ظالم تماش بینوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، یہ شعلے اتنی تیزی اور قوت کے ساتھ لپکے کہ ان کو بھاگنے کی فرصت ہی نہ ملی اور ان سب کو جلا کر بھسم کر دیا۔ تمام خندقوں میں یہ آگ اسی طرح لپکی اور سب کو ہلاک کیا۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مؤمنین کو آگ میں ڈالتے ہی آگ کے چھونے سے پہلے ہی ان کی روح قبض کر لی جاتی تھی اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں پہنچا دیتے اس لیے ان کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔

مکافاتِ دنیوی کے متعلق ایک باریک نکتہ:

اس قصے میں ایک باریک نکتہ ہے، جس کی طرف حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین گئے ہیں، وہ یہ کہ بادشاہ کے ہاتھوں اس لڑکے کا قتل ہونا مکافاتِ دنیوی کی وجہ سے تھا (یعنی دنیا میں اپنے عمل کا بدلہ) چونکہ اس نے راہب سے عہد کیا تھا کہ اس کا نام ظاہر نہیں کرے گا پھر اس عہد پر برقرار نہ رہ سکا جس کے نتیجے میں راہب کو قتل کیا گیا تھا، اسی عمل کے بدلے میں بادشاہ نے اس لڑکے کو قتل کیا، ورنہ بادشاہ کبھی بھی اس پر قابو نہ پا سکتا۔

مکافاتِ دنیوی کا الگ نظام ہے، جو مکافاتِ اخروی سے جدا ہے، مکافاتِ دنیوی کی ایسی صورتیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث نہیں ہوتی یہ محض بدلے کی صورت ہوتی ہے حقیقت میں اللہ کے ہاں یہ سزا ترقی درجات کا ذریعہ ہوتی ہے، چنانچہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنیوں کے پیٹ چاک کیے تھے اور ان کے جگر نکال کر کباب بنا کر کھائے تھے، اسی سبب سے کفار کو یہ قدرت ہوئی کہ ان کو شہید کیا اور ان کا جگر نکال کر چبایا۔ (واللہ اعلم)

(جاری ہے)

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

علاوہ بریں یہاں آپ اور آپ کے موکل، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رجوع پر ایک استدلال پیش کر رہے ہیں (دیکھو آثار ص ۱۳۰) اور ص ۱۱۹ میں آپ فرما چکے ہیں کہ ''مقام استدلال میں ''ہوگا'' اور ''ہوگی'' سے کام نہیں چلتا'' پھر یہاں ''ہوگا'' اور ''ہوگی'' سے کیوں کام لے رہے ہیں۔

اس کے بعد گذارش ہے کہ مجیب نے یہاں دو جگہ ٹھوکر کھائی ہے، یا قصداً مغالطہ سے کام لیا ہے (۱) ایک یہ کہ ہم تک پہنچنے کی یہی ایک صورت نہیں ہے کہ حضرات صحابہ سے فرمایا ہو بلکہ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی ایک صحابی سے کہا ہو اور انھیں ایک صحابی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہو (۲) ہم تک پہنچنے کی یہ صورت بھی ضروری نہیں ہے کہ صحابی ہی سے فرمایا ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ کسی تابعی سے کہا ہو، پس جب یہ دونوں صورتیں بھی ممکن ہیں تو حضرت عمر کے اس اثر کا ہم تک پہنچنا اس بات کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا کہ انھوں نے اس کو حضرات صحابہ سے کہا تھا، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک صحابی یا تابعی سے کہا ہو، اور جب یہ ثابت نہیں ہوا تو مجمع صحابہ میں اعلان کرنا ثابت نہ ہوا۔

کس قدر حیرت انگیز جسارت ہے کہ جب امام شافعی وغیرہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے خود اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف فتویٰ دیے ہیں، لہذا اگر وہ منسوخ نہ ہو تو خود ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی مخالفت کیونکر کرسکتے ہیں تو اس کو خیالی وادعائی واحتمالی نسخ کہہ دیا جاتا ہے اور نسیان وغیرہ کا خیالی احتمال پیدا کر کے اس حجت کو رد کر دیا جاتا ہے، لیکن جب وہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تین طلاقوں کو نافذ کرنا اور نافذ کرنے کا حکم دینا بیان کرتے ہیں اور ان کا یہ بیان بھی صحیح مسلم ہی وغیرہ میں مذکور ہوتا ہے تو اسماعیلی کی ایک مجمل ومبہم روایت سے جس کی نہ تو صحت پر کوئی دلیل قائم ہے، نہ اس میں رجوع کی تصریح ہے، نہ تین طلاقوں کا ذکر ہے، نہ

ان کے نافذ کرنے کا تذکرہ ہے، نہ صحابہ کے مجمع میں اس کے اظہار کا کوئی ثبوت ہے، اپنی طرف سے ان سب باتوں کا خیالی وادعائی احتمال پیدا کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رجوع کا دعویٰ کر دیا جاتا ہے اور مسلم وغیرہ کی روایت کو کالعدم اور بے کار قرار دیا جاتا ہے فیا للعجب و لضیعة الادب.

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

(۵) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجوع کر لیا ہوتا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ابوالصہباء کے جواب میں صرف اتنا کہہ کر ہرگز خاموشی اختیار نہ کرتے کہ "جب طلاق کے واقعے بکثرت ہونے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق کو نافذ کر دیا"، بلکہ اس کے بعد رجوع کا واقعہ بھی ضرور ذکر کرتے اس لیے کہ اس سلسلہ کی وہ نہایت ضروری کڑی تھی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی شان اس سے بہت بالاتر ہے کہ اس ضروری حصے کو چھوڑ کر لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہی رائے آخری لمحۂ حیات تک رہی اور واقعہ اس کے خلاف ہو، اگر غلط فہمی سے قطع نظر کیجئے تو بھی اس کو کوئی ادنی درجہ کا دیندار جائز قرار نہیں دے سکتا کہ اس آخری حصے کو حذف کر دے جس طرح کہ کوئی اس کو جائز نہیں کہہ سکتا کہ صرف یوں کہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی اجازت دی تاوقتیکہ اس کے ساتھ یہ بھی نہ کہے کہ پھر اس کو منسوخ فرما دیا۔ (اعلام ص ۲۵)

صاحب آثار سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا، اس لیے صرف یہ لکھ کر گلوخلاصی کی کوشش کی ہے کہ نہ ذکر کرنے کی بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں، لیکن یہ اس وقت ذکر کی جائیں گی جب آپ حدیث ابن عباس کے ناسخ کے نہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کریں گے الخ (آثار ص ۱۳۲)

لیکن مجیب کو کیا معلوم تھا کہ یہ لکھنے کے بعد بھی گلوخلاصی نہیں ہوسکتی، حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ناسخ کے نہ ذکر کرنے کی وجہ ہم نے بیان کر دی ہے اب مجیب کا فرض ہے کہ وہ اپنی بہت سی وجہیں بیان کریں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

(۶) میں نے علامہ ابن القیم کی عبارتوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ صحابہ کی موافقت کو مسئلہ امضائے ثلاث میں تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حسن سیاست کے معتقد تھے اس لیے انھوں نے بھی ان کے امضائے ثلاث کے فیصلہ کو تسلیم کیا اور

ان کے قول سے اتفاق کیا پس میں پوچھتا ہوں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ سے رجوع کرلیا تو کیا وجہ ہے کہ صحابہ اسی پہلی بات اڑے رہے، انھوں نے کیوں رجوع نہیں کرلیا اور کیوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد بھی وقوع ثلاث کا برابر فتویٰ دیتے رہے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''پہلے یہ ثابت کیجئے کہ صحابہ کے جو آثار وقوع ثلاث کے متعلق ہیں یہ حضرت عمر کے بعد کے ہیں۔لیکن انشاء اللہ تا قیام قیامت آپ اس کو نہیں کرسکتے الخ''

جواب:- بس انھیں معلومات پر حضرت مولانا کہلانے کا شوق ہے، اچھا سنئے! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مجاہد وسعید بن جبیر وعمرو بن دینار وغیرہ نے وقوع ثلاث کا اثر روایت کیا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت مجاہد کی عمر صرف دو برس کی تھی، اور سعید وعمرو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے ۲۳ ر برس بعد پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا ان حضرات نے حضرت ابن عباس سے وقوع ثلاث کے جو فتوے نقل کیے ہیں وہ یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کے ہیں، یہ بھی یاد رہے کہ مجاہد کا لفظ یہ ہے **کنت عند ابن عباس فجاءہ رجل الخ**، اور سعید کا لفظ یہ ہے **جاء رجل الی ابن عباس فقال الخ**. حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حبیب بن ابی ثابت وقوع ثلاث کا فتویٰ نقل کرتے ہیں اور حبیب نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے لہٰذا انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ فتوی یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد سنا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرو سے عطاء بن یسار نے ان کا فتویٰ روایت کیا ہے اور وہ حضرت عمر کی وفات کے وقت چار برس کے تھے، پس ظاہر ہے کہ انھوں نے بھی یہ فتویٰ حضرت عبداللہ ابن عمرو سے حضرت عمر کے بعد سنا ہے، اور حضرت ابن عمر سے نافع نے روایت کیا ہے اور نافع نے حضرت عمر کا زمانہ نہیں پایا ہے جیسا کہ ترمذی وابکار المنن سے ظاہر ہوتا ہے، پس انھوں نے بھی وقوع ثلاث کا فتویٰ حضرت ابن عمر سے حضرت عمر کے بعد سنا ہے، وعلی ہذا القیاس۔ کہئے جناب آپ کی پیشین گوئی جھوٹی ہوگئی یا نہیں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اس کے بعد یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ خود علامہ ابن القیم نے اس روایت کو حضرت عمر کا رجوع ثابت کرنے کے لیے نہیں پیش کیا ہے، نہ انھوں نے اس سے رجوع کرنا سمجھا ہے اور نہ وہ اس

بات کے قائل ہی ہیں کہ حضرت عمر نے رجوع کیا، بلکہ یہ سب مخالفینِ زمانہ کی طبع زاد باتیں ہیں جس کا منشاء بجز کم سوادی کے اور کچھ نہیں ہے۔ علامہ ابن القیم نے اس روایت کو جس غرض سے پیش کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہوگی کہ میں پورا سلسلۂ کلام نقل کردوں۔ سنیے! بات یہ ہے کہ جب موصوف اپنے زعم میں تین طلاقوں کا ایک ہونا ثابت کر چکے تو ان کو یہ مشکل پیش آئی کہ جب تین طلاقیں ایک کے حکم میں ہیں اور ان کے بعد رجعت جائز ہے تو خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم نے کیوں ان کو تین قرار دیا اور ان کے بعد رجعت کو ممنوع کہا، تو علامہ موصوف نے اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا کہ حضرت عمر کے فعل کو سیاست پر حمل کیا جائے، چنانچہ کہہ دیا کہ حضرت عمر نے تین طلاقوں کو سیاسۃً نافذ کر دیا اور تین طلاق دینے والوں کی یہی سزا قرار دے دی کہ ان سے ان کی بیبیوں کو جدا کر دیا جائے اور عذابِ فراق اور داغِ مہجوری کا مزہ ان کو چکھایا جائے، لیکن اس حل پر خود علامہ کو اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے خود ہی اس پر اعتراض کیا کہ جب سیاست وعقوبت ہی منظور تھی تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ تین طلاقوں کو نافذ کر کے (بخیال علامہ رحمۃ اللہ) عہد نبوی وعہد صدیقی کے فیصلوں کی مخالفت کے مرتکب ہوتے یہی کیوں نہ کیا کہ تین طلاق دینے کو حرام کر دیتے اور اعلان کرا دیتے کہ جو ایسا کرے گا وہ سخت سزا کا مستحق ہوگا، بہر حال سیاست اسی میں تو منحصر نہ تھی کہ تین طلاقوں کا نفاذ کر دیا جاتا، بلکہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ تین طلاقوں کو حرام کر دیا جاتا اور دوسری تعزیرات نافذ کر کے ایقاع ثلٰث کو بند کر دیا جاتا۔ اس کے جواب میں علامہ ابن القیم نے کہا ہے کہ بے شک حضرت فاروق اعظم کے لیے سیاست کی موخر الذکر صورت ممکن تھی، لیکن انھوں نے نہ کیا اور اس نہ کرنے پر نادم ہوئے، چنانچہ مسند عمر کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ندامت تھی کہ انھوں نے طلاق کو حرام کیوں نہیں کیا۔ بس یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ابن القیم نے روایت اسماعیلی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر تین اکٹھی طلاقوں کے واقع کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔

اس تفصیل سے خوب واضح ہوگیا کہ ابن القیم نے اس روایت کو اس کا ثبوت دینے کے لیے نہیں پیش کیا ہے کہ حضرت عمر تین طلاقوں کے نافذ کرنے پر نادم تھے، بلکہ اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ حضرت عمر اکٹھے تین طلاقوں کو حرام قرار نہ دینے پر نادم تھے۔ پس اس ندامت سے اگر رجوع ثابت ہوسکتا ہوگا تو یہ ثابت ہوگا کہ حضرت عمر نے تین طلاق کو جائز کہنے سے رجوع کر لیا، یعنی تین

طلاق کو حرام کہنے لگے لیکن تین طلاقوں کے حرام ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو واقع بھی نہ ہوگی، دیکھئے حالت حیض میں طلاق دینا ناجائز ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی بی بی کو بحالت حیض ایک طلاق دی تو آنحضرت ﷺ نے اس کے واقع ہونے کا فتویٰ دیا اور چونکہ ایک ہی طلاق تھی اس لیے حضرت عبداللہ بن عمر سے رجعت کرائی۔ بہرحال ابن القیم کے کلام سے بھی کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ اس روایت کا کوئی تعلق حضرت عمر کے رجوع سے ہو۔

صاحب آثار نے میری اس طویل عبارت کی ابتدائی دو سطریں نقل کر کے لکھا ہے ''کیا آپ نے اپنی طرح مفتی بنارس کو حافظ ابن قیم کا مقلد سمجھ لیا ہے؟............ابن قیم نے اس سے ایک مسئلہ مستنبط کیا، مفتی بنارس نے اس سے ایک دوسرا مسئلہ بھی اخذ کیا، اس میں کیا نقص ہے'' (آثار ص۱۳۳)

جواب:- زبان سے تو آپ تقلید کا انکار ضرور کرتے ہیں، لیکن آپ کا رسالہ یا بنارسی کا فتویٰ پڑھنے والے اچھی طرح سمجھ گئے کہ آپ کے یا ان کے پاس ابن القیم کی تقلید جامد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے اگر میں آپ کو اور ان کو ابن القیم کا مقلد سمجھوں تو غلط نہیں ہے، تاہم میں نے اعلام میں اس مقام پر جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ منشا نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے میرے دو مقصد ہیں، ایک مقصد موافقین ومخالفین کو یہ بتانا ہے کہ ابن القیم حضرت عمر کے رجوع کے نہ قائل ہیں، نہ اس روایت کو انھوں نے اثبات رجوع کے لیے پیش کیا ہے، بلکہ آج کل کے کم سواد مخالفین کا یہ ایک دعویٰ ہے، جو ان کی نافہمی وکم علمی کا رہین منت ہے، اس لیے قطعاً ناقابل التفات ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ علامہ ابن القیم جنھوں نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ثابت کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا ہے، لیکن جب ان کو خیال آیا ہے کہ پھر حضرت عمر نے کیوں تینوں طلاقیں نافذ کیں اور اکابر صحابہ نے ان کی موافقت کیوں کی؟ تو ان کو جو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے: **هذا السوال لعمر الله وارد يحتاج الى جواب شاف** یعنی یہ سوال خدا کی قسم وارد ہوتا ہے اور شافی جواب کا محتاج ہے (اغاثہ) پھر اس کے بعد صفحہ کا صفحہ سیاہ کر ڈالا ہے، لیکن مذکورہ جواب کے سوا اور کوئی جواب نہیں دے سکے ہیں، پس اگر اس روایت میں حضرت عمر کے رجوع کا ادنی سے ادنی اشارہ بھی ہوتا تو ناممکن تھا کہ وہ اس کو ذکر نہ کرتے، اور بجائے صفحہ کا صفحہ لکھنے کے دو لفظوں میں قصہ ختم نہ کر دیتے۔ پس اب تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہ روایت رجوع پر قطعاً دلالت نہیں کرتی اور یہی بات بھی ہے فہو المراد۔

دوسری یہ کہ دلالت تو کرتی ہے لیکن ابن القیم نے اس کو نہیں سمجھا، پس اگر یہ بات ہے تو مخالفین زمانہ کو چاہئے کہ صاف صاف اس کو لکھ کر اپنی حق بیانی کا نمونہ پیش کریں، نیز یہ بھی بتائیں کہ جب ان کے خیال میں اس روایت سے حضرت عمر کا رجوع بخوبی ثابت ہے اور حضرت عمر کے الفاظ کا بجز اس کے اور کوئی مطلب ہی نہیں ہوسکتا تو ابن القیم کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آئی؟

تیسری یہ کہ ابن القیم نے اس کو سمجھا لیکن ذکر نہیں کیا۔ پس اگر یہ صورت ہے تو بتایا جائے کہ ابن القیم کے سمجھنے کی کیا دلیل ہے؟

بھلا کون صاحب عقل تسلیم کرسکتا ہے کہ وہ اس کو سمجھ کر حضرت عمر کے امضائے ثلاث کے جواب میں چھوڑ جائیں گے اور ایک نہایت بودا جواب ذکر کریں گے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اس مقام پر پہنچ کر میں ظاہر کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ابن القیم نے حضرت عمر کی جانب سے جو اعتذار پیش کیا ہے وہ حد درجہ کمزور اور بودا بلکہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

اولاً:- امضائے ثلاث کو سیاست وعقوبت کہنا خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ خود ابن القیم کے قول کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ آپ ابھی معلوم کرچکے ہیں کہ ابن القیم کی تحقیق میں حضرت عمر تین اکٹھی طلاقیں دینے کو جائز سمجھتے تھے، پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد علامہ موصوف اس فعل جائز پر تعزیر وعقوبت کو کس قانون شرعی کے مطابق جائز ثابت کریں گے، خود ابن القیم نے اعلام الموقعین ص۳۲ میں لکھا ہے: **وکثیر من الفقهاء لایری تحریمه فکیف یعاقب من لم یرتکب محرما عند نفسه**، یعنی آج تین طلاق دینے والوں کو سزا دینا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ بہت سے فقہاء اس کو حرام نہیں جانتے تو جب وہ مرتکب حرام نہیں ہوا تو اس کی سزا کیسے ہوسکتی ہے، مجھے حیرت ہے کہ علامہ موصوف امضائے ثلث کو عقوبت کہتے وقت یہ بات کیسے بھول گئے اور یہ پوچھتے ہوئے تو میرا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے کہ کسی جائز فعل پر تعزیر وعقوبت کی نسبت فاروق اعظم کی طرف کرنے کے لیے کون سا دل وجگر پیدا کریں گے (اعلام)

ناظرین پہلے یہ ملاحظہ فرمائیں کہ میں نے اس سے پہلے علامہ ابن القیم کی جو طویل تقریر نقل کی ہے اس کا ایک حرف بھی مجیب نے نقل نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اسے چھوڑ گئے ہیں کہ ''اس سے مفتی بنارس

کو کوئی سروکار نہیں ہے،'' لیکن جب اس تقریر پر میں نے مواخذہ شروع کیا تو ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور میرے مواخذات کا جواب دینے بیٹھ گئے، حالانکہ عقل سے کام لیتے تو جب اس تقریر سے ان کو یا مفتی بنارسی کو کوئی سروکار نہ تھا تو اس پر جو اعتراضات ہیں ان سے بھی سروکار نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ مجیب نے میرے مواخذات کا جواب دینے سے پہلے ایک طویل تمہید لکھی ہیں اور اسی پر اپنے جوابات کی بنیا درکھی ہے اور بار بار اس تمہید کے اجزا کا حوالہ دیا ہے، میں اس پر مستقل طور سے تفصیلی بحث کر کے اپنے رسالہ کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا بلکہ جہاں جس جز کا حوالہ مجیب صاحب دیں گے، وہیں اس کی حقیقت کھول دی جائے گی۔ اس کے بعد میرے پہلے مواخذہ کا جواب سنیے:

صاحب آثار لکھتے ہیں:

اولاً فقہ کی معتبر کتابوں میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ حضرت عمر کا یہ حکم سیاسی اور تعزیری تھا

....

ثانیاً:- جس قانون شرعی کے مطابق حضرت عمر نے .... یہودی کو درے لگائے اور حضرت حذیفہ کو طلاق دینے پر مجبور کیا تھا، اسی قانون شرعی کے مطابق .... باوجود جمع ثلاث کے جائز ہونے کے ....تعزیر فرمائی تھی، دیکھو تمہید ص ۳و۴۔

جواب:- پہلے میں ناظرین کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجیب نے یہاں پر چالاکی کی ہے کہ میں نے ابن القیم کی جو عبارت اس مقام پر اعلام میں نقل کی ہے اس کو اور اس کے ترجمہ کو مجیب ہضم کر گئے ہیں اس لیے کہ اگر وہ اس کو نقل کر دیتے تو ان کے اس جواب کو ایک جاہل بھی منہ چڑھانے سے تعبیر کرتا۔

اعلام کی عبارت کا حاصل یہ ہے اور میں ابن القیم سے یہ عرض کر رہا ہوں کہ آپ حضرت عمر کی نسبت یہ خیال بھی رکھتے ہیں کہ وہ تین طلاقوں کو جائز سمجھتے تھے۔ اور ان کے نافذ کرنے کو عقوبت بھی کہتے ہیں حالانکہ آپ خود اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۲ میں لکھتے ہیں کہ جائز فعل پر عقوبت نہیں ہوسکتی، پس آپ تین کے نافذ کرنے کو عقوبت کس طرح کہہ سکتے ہیں، یعنی امضائے ثلث کے عقوبت وسیاست قرار دینے کو میں خود ابن القیم کے قول کے خلاف ثابت کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ میں نے اعلام میں اس کو بصراحت لکھا ہے۔ اب کوئی اہل حدیث ہی انصاف سے کہے کہ اس کا مجیب نے کیا جواب

دیا اور جب ان کی سمجھ کا یہی حال ہے تو وہ کیا جواب دیں گے؟ تھوڑی دیر کے لیے اس جھوٹ کو بھی سچ مان لیجیے کہ ''فقہ کی معتبر کتابوں میں حضرت عمر کے حکم کو سیاسی لکھا ہے'' تو کیا اس سے ابن القیم کے اقوال کا تعارض اٹھ گیا؟ اسی طرح اگر حضرت عمر نے کسی یہودی کو جناب کے خیال میں کسی جائز فعل پر درے لگائے تو اس سے ابن القیم کو فائدہ پہنچا یا نقصان؟ اہل علم تو یہی جانتے ہیں کہ اس سے ابن القیم کے اس قول کی کہ جائز فعل پر عقوبت نہیں ہوسکتی تردید وتغلیط ہوگئی۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ مجیب صاحب اٹھے تو ہیں ابن القیم سے میرے اعتراضات کو دفع کرنے کے لیے اور کر رہے ہیں ان کی تغلیط وتردید۔

کہیے جناب مجیب اب تو آپ کی سمجھ میں بھی آرہا ہوگا کہ میرے اعتراضات صرف میرے خیال میں نہیں بلکہ فی الحقیقت زبردست ہیں، اور یہ کہ علامہ ابن القیم کے حق میں آپ کی یہ دوستی چوں دشمنی است کا مصداق ہے، اس کے بعد کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ کچھ اور لکھا جائے، لیکن مجیب کی غلط بیانی ظاہر کرنے اور غلط فہمی دور کرنے کے واسطے عرض ہے کہ پہلی بات کا جواب باب دوم میں دیا جاچکا ہے اور بتایا جاچکا ہے کہ یہ بات سوائے قہستانی کے اور کسی نے نہیں کہی ہے، اور انھیں کے حوالہ سے بعض دوسرے مصنفین نے بھی ذکر کیا ہے، اور قہستانی کے ایسے اقوال اور ان کی کتاب جامع الرموز معتبر نہیں ہے۔

علاوہ بریں قہستانی نے اگر اس کو سیاست وتعزیر کہا ہے تو ان پر یہ اعتراض نہیں پڑتا جو ابن القیم پر پڑتا ہے، اس لیے کہ قہستانی نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت عمر تین طلاقوں کو جائز سمجھتے تھے۔

نیز قہستانی کے سیاسی کہنے اور آپ کے سیاسی کہنے میں بڑا فرق ہے، آپ کے نزدیک سیاسی کی مراد یہ ہے کہ وہ غیر شرعی ہے، جیسا کہ آثار ص ۱۲۰ سے ظاہر ہوتا ہے اور قہستانی کے نزدیک وہ باوجود سیاسی ہونے کے شرعی بھی ہے اور آج تک وہی حکم باقی ہے۔

اب رہا آپ کا یہودی کے واقعہ سے جائز فعل پر جواز تعزیر کا استدلال تو عرض ہے کہ ع

تو آشنائے حقیقت نہ خطا اینجا ست

مہربان من! یہودی نے جائز فعل نہیں کیا تھا، بلکہ ناجائز فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ کسی نااہل آدمی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بات کو شرعاً حق یا ناحق کہے اور نااہل شخص کسی

بات پر ایسا حکم لگائے گا تو اگر اس کا حکم اتفاقی طور پر صحیح ہوگا جب بھی وہ گنا ہگار ہوگا۔ اس واقعہ میں حضرت عمر کا فیصلہ بے شبہ صحیح تھا، لیکن چونکہ یہودی احکام اسلام سے ناواقف اور شریعت اسلامیہ کے اصولِ قضا سے جاہل تھا اس لیے اس کو اس فیصلہ پر حق یا ناحق ہونے کا حکم لگانا جائز نہ تھا اور یہ اس کی ایک ناروا جرأت تھی اس لیے حضرت عمر نے اس کو درہ لگایا اور فرمایا کہ **مــــا یــــدریک** (یعنی تو کیا جانے؟) حضرت کا **مــا یدریک** (تو کیا جانے؟) فرمانا صاف بتا رہا ہے کہ درہ لگانے کی وہی وجہ تھی جو میں نے ذکر کی ہے۔ مگر مجیب صاحب نے از راہ غایت ''دیانت'' یہ فقرہ نقل ہی نہیں کیا ہے۔ اور حضرت حذیفہ کے واقعہ میں مطلقاً کسی تعزیر کا ذکر ہی نہیں، حتی کہ نگاہ خشمگیں ڈالنے کا بھی کوئی اشارہ تک نہیں، لہٰذا اس کا حوالہ دینا سراسر مغالطہ وابلہ فریبی ہے، زیادہ سے زیادہ اس میں ایک جائز فعل سے روکنا مذکور ہے، لیکن یہاں جائز فعل سے روکنے کی بحث نہیں ہے بلکہ جائز فعل پر سزا دینے کی بحث ہے، افسوس ہے کہ مجیب ان دونوں باتوں میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔

علاوہ بریں جب مجیب خود ہی فرماتے ہیں کہ ''بسا اوقات ایک جائز فعل کسی مفسدہ کا باعث ہوتا ہے، اور اس وجہ سے امیر وخلیفہ اس کو جائز سمجھتے ہوئے بھی اس سے روک دیتے ہیں'' اور حضرت حذیفہ کا یہودی عورت سے نکاح کرنا ایسا ہی تھا چنانچہ مجیب خود ان کے واقعہ میں حضرت عمر کے الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ اور مسلمان تمھاری اقتدا کریں اور اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے جمال کی وجہ سے پسند کریں مسلمانوں کی عورتوں کے لیے یہ بہت بڑا فتنہ ہے'' (آثار ص ۱۳۵)

تو میں کہتا ہوں کہ جب کوئی فعل مفسدہ کا باعث اور بہت بڑے فتنہ کا ذریعہ ہو گیا تو وہ واجب ترک ہو گیا۔ پس اگر کوئی اس کو نہ چھوڑے گا تو ترک واجب کی وجہ سے مستحق تعزیر ہوگا، لہٰذا اگر اس واقعہ میں تعزیر کا ذکر ہوتا بھی تو وہ تعزیر جائز فعل پر نہیں، بلکہ خود مجیب کے مسلمات سے ناجائز پر ہوتی۔

اب اگر مجیب یہ فرمائیں کہ تین طلاقوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان کو حضرت عمر جائز سمجھتے تھے، لیکن چونکہ وہ مفسدہ کا باعث تھیں اس لیے سزا کے طور پر ان کو نافذ کر دیا، تو میں مجیب سے پوچھوں گا کہ وہ مفسدہ کیا ہے؟ مشورہ کر کے جواب دیجیے۔

(جاری ہے)

اثنا عشری امامی شیعہ مذہب کے خدوخال

تحریر: سید محب الدین خطیب مصری ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

(چھٹی قسط)

علقمی اور ابن ابی الحدید کی خیانتیں

اس بدترین خیانت کے ارتکاب میں شیخ الشیعہ نصیر طوسی کے ساتھ اس کے دو ساتھی بھی شریک رہے ہیں، ان میں سے ایک شیعہ وزیر محمد بن احمد علقمی ہے، اور دوسرا ایک معتزلی مصنف ہے جو اپنے تشیع میں شیعوں سے بھی بڑھا ہوا ہے، اور وہ ابن العلقمی کا دست راست عبدالحمید بن ابی الحدید ہے، وہ زندگی بھر آنحضرت ﷺ کے صحابہ کا دشمن رہا، اس نے ''نہج البلاغہ'' نامی کتاب کی جو بدترین شرح لکھی ہے وہ اس قدر جھوٹی اور بے سروپا باتوں سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے اسلام کی تاریخ کو داغ دار کرکے رکھ دیا ہے۔ اس کی دروغ بیانیوں سے وہ لوگ مسلسل دھوکہ کھاتے چلے آرہے ہیں، جو لوگ اسلامی تاریخ کی سچائیوں اور اس کے اندر داخل کی گئی فریب کاریوں سے واقف نہیں ہیں، حتی کہ ہمارے بہت سے دانشمند فضلاء اور مصنفین بھی اس کے دام فریب کا شکار ہوگئے ہیں۔ ابن العلقمی جس کو مستعصم باللہ نے رواداری اور شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا وزیر بنایا، اس کا جواب اس نے خیانت و بدعہدی کے ساتھ دیا، اور اپنے محسن کے احسان کا بدلہ اس نے بے وفائی اور کمینگی کے ساتھ چکایا۔ (ابن العلقمی کی غداری کے نتیجے میں) ہلاکو خاں نے اسلام اور مسلمانوں پر جو قیامت برپا کی تھی شیعہ اپنی اسلام دشمنی اور درپردہ عداوت کی وجہ سے آج تک اس کی لذت اور چاشنی محسوس کررہے ہیں، جس کا جی چاہے شیعوں کے تذکرہ وتراجم کی ان کتابوں کو اٹھا کر پڑھ لے جن کے اندر انھوں نے نصیر طوسی کا تذکرہ لکھا ہے، جس سلسلے کی آخری کتاب خونساری کی ''روضات الجنات'' ہے۔ یہ قاتلوں اور غداروں کی تعریف سے لبریز ہے، اور اس وقت اسلام پر

جو مصیبت آئی تھی اس پر خوشی اور عوام وخواص کی خونریزی پر آسودگی کے اظہار سے پُر ہے، مسلمان مردوں اور عورتوں حتیٰ کہ بچوں اور بوڑھوں کو جو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا تھا اور جس پر خوشی کے اظہار سے سخت ترین دشمن اور سنگدل سے سنگدل آدمی بھی شرم محسوس کرتا ہے اس پر بھی مسرت وخوشی سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔

اختصار اور شیعوں کی معتبر کتابوں کی عبارتوں پر اکتفا کی خواہش کے باوجود یہ موضوع طویل ہو گیا، اب ہم اس کو ایک ایسی عبارت پر ختم کرتے ہیں جو اتحاد وہم آہنگی کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے، تاکہ دوسری جماعتوں اور مذہبوں کے افراد کے درمیان اتحاد ویکجہتی کے امکان، اور شیعوں کے ساتھ اتحاد کے عدم امکان کو ہر مسلمان اچھی طرح جان لے، یہ عبارت ان کا یہ صریح درج ذیل بیان ہے:

شیعہ علماء کا تذکرہ نگار خونساری اپنی کتاب ''روضات الجنات'' کے صفحہ ۵۷۹، طبع دوم، مطبوعہ طہران ۱۳۶۷ھ میں نصیر طوسی کے طویل تذکرہ میں لکھتا ہے کہ ان کی حقیقی ولطیف اور حق وتحقیق کو سچ ثابت کر دینے والی بات ۷۳ فرقوں میں سے ایک فرقۂ ناجیہ کی تعیین میں ان کا یہ قول ہے کہ یہ فرقۂ امامیہ ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ:

''میں نے تمام مذاہب کو پرکھا، اور ان کے اصول وفروع کا علم حاصل کیا، تو میں نے امامیہ کے علاوہ سب کو ایمان کے اصول میں مشترک پایا، اگرچہ بعض ایسی چیزوں میں ان کا اختلاف ہے جن کا اثبات ونفی ایمان کے تعلق سے برابر ہے، پھر میں نے فرقۂ امامیہ کو ان کے اصول میں سب سے مخالف پایا، لہذا اگر امامیہ کے علاوہ کوئی فرقۂ ناجی (نجات پانے والا) ہوگا، تو سب کے سب نجات پانے والے ہوں گے، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نجات پانے والا فرقہ امامیہ ہی ہوگا، کوئی اور نہیں ہوگا''۔

اہل بیت کے ساتھ ولایت کے بغیر نجات نہیں ہوگی

خونساری نے لکھا ہے کہ سید نعمۃ اللہ موسوی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ نجات کا تعلق کلمۂ شہادتین سے ہے، ان کا استدلال آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ہے کہ ''**من قال لا إلٰه إلا اللّٰه**

دخل الجنة'' (جس نے لا إلٰه إلا الله کہا وہ جنت میں داخل ہوگا) رہا فرقۂ امامیہ تو وہ اس بات پر متفق ہے کہ بارہ اماموں تک اہل بیت کے ساتھ ولایت اور ان کے دشمنوں سے برأت (یعنی ابوبکر وعمر سے لے کر بجز شیعوں کے ہر وہ شخص جو اسلام کو مانتا ہے) کے بغیر نجات نہیں ہوگی (۱)، تو یہ فرقہ اس اعتقاد میں جس پر نجات کا مدار ہے تمام فرقوں سے الگ اور مختلف ہے''۔

شیعوں کا مسلمانوں سے اختلاف صرف فروع میں نہیں اصول میں بھی ہے

طوسی، موسوی اور خونساری نے سچ بھی کہا ہے، اور جھوٹ بھی بولے ہیں۔

ان کا سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقے اصول میں ایک دوسرے سے قریب ہیں، ثانوی امور میں ان کے درمیان اختلاف ہے، اس لیے اصول میں ایک دوسرے سے قریب فرقوں کے درمیان اتحاد وہم آہنگی ممکن ہے، لیکن یہ اتحاد وہم آہنگی امامی شیعوں کے ساتھ ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اصول میں تمام مسلمانوں کے خلاف ہیں، اور وہ اس سے کم پر راضی نہیں ہیں کہ تمام مسلمان ''جبت وطاغوت'' سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور ان کے ماسوا اب تک جو لوگ ہوئے ہیں، ان سب پر لعنت کریں، اور ہر اس شخص سے جو شیعہ نہیں ہے، برأت ظاہر کریں، حتی کہ اہل بیت یعنی آنحضرت ﷺ کی ان صاحبزادیوں سے بھی جو ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عقد نکاح میں رہیں، اور بنی امیہ کے شریف اور بہادر چشم وچراغ حضرت عاص بن الربیع سے بھی جن کی تعریف آنحضرت ﷺ نے تمام مسلمانوں کی موجودگی میں اس وقت برملا کی تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح اور ان کو آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کی سوکن بنانے کا ارادہ کیا تھا، تو اس بات کی شکایت حضرت فاطمہ نے اپنے والد محترم (ﷺ) سے کی تھی۔ اسی طرح زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب اور ان تمام اہل بیت سے برأت ہونی چاہیے جو

---

(۱) شیعہ عقیدۂ امامت پر ایمان لانے کو ایمان کے ارکان میں سے ایک رکن خیال کرتے ہیں، اس کی حیثیت ان کے نزدیک اس طرح ہے جس طرح اللہ پر اور اس کی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لانے کی ہے، اور شہادتین اور نماز کی طرح اسلام کا ایک رکن ہے، یعنی جو عقیدۂ امامت پر ایمان نہیں لائے گا وہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق کافر ہوگا (دیکھیے اصول کافی ج اص ۲۱۰، عسیفی صفحہ ۲۳-۲۵، دستور، دفعہ ۲، فقرہ ۵) (سعید اسماعیل)

شیعوں کے پیچیدہ عقائد میں ان کے پرچم تلے نہیں آئے (۱)، ان عقائد میں قرآن کریم کے محرّف ہونے کا وہ دعویٰ بھی ہے، جو شیعہ ہر دور اور ہر طبقے میں کرتے چلے آئے ہیں، جیسا کہ شیعوں کے ہر دلعزیز اور محبوب مرزا حسین بن محمد تقی نوری طبرسی نے اپنی کتاب "**فصل الخطاب في إثبات تحريف كتاب رب الأرباب**" میں نقل کیا ہے، جس نے اس کی ایک ایک سطر کی تصنیف کے گناہ کا ارتکاب جلیل القدر صحابی اور امیر کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس کیا ہے، جس کے بارے میں شیعہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قبر ہے۔

شیعہ اپنے ساتھ ہم آہنگی اور ہمارے قرب سے اپنی رضامندی کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہم بھی صحابۂ کرام پر لعنت کریں، اور ہر اس شخص پر تبرّا کریں جو ان کے مذہب پر نہیں ہے، حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں اور آپ کی ذریت کے بابرکت اور برگزیدہ افراد سے برأت کا اظہار کریں، جن میں سرفہرست حضرت زید بن زین العابدین اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جو شیعوں کی خرافات سے ناپسندیدگی کے اظہار میں ان کے ساتھ ہیں۔ نصیر طوسی کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے اس کا سچا اور حقیقی مفہوم یہی ہے، اس عقیدے کے نقل میں طوسی کا اتباع سید نعمۃ اللہ موسوی اور مرزا محمد باقر خونساری اصفہانی نے بھی کیا ہے، اور خفیہ یا علی الاعلان تقیہ کرنے والے شیعوں میں سے ایک شخص بھی اس عقیدے میں ان کا مخالف نہیں ہے۔

اور رہا ان کا جھوٹ تو ان کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف کلمۂ شہادتین کو زبان سے ادا کردینا شیعوں کے علاوہ کے نزدیک آخرت کے اندر نجات کے لیے کافی ہے، اگر ان کو عقل ہوتی یا ان کے پاس علم ہوتا تو ان کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ ہمارے (اہل سنت کے) نزدیک شہادتین کا کلمہ اسلام میں

---

(۱) درحقیقت، شیعوں کے ائمہ تک طعن سے محفوظ نہیں رہے، کیونکہ شیعوں کا کہنا ہے کہ علی کو پیغمبر کے بعد مسلمانوں کی امارت کا خدا کی طرف سے جوان کو مکلّف بنایا گیا تھا، اس میں انھوں نے تقیہ کرتے ہوئے تہاون سے کام لیا، بلکہ وہ لوگ کھلے عام یہ بات کہتے ہیں کہ علی نے - جو کہ اللہ کے حکم پر عمل درآمد میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں تھے - زمام خلافت سنبھالنے کے بعد اللہ کا حکم نافذ کرنے میں اس بات کے ڈر سے تہاون کیا کہ کہیں حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے، چنانچہ یہ شیعہ ان کی طرف یہ جھوٹ منسوب کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ: مجھ سے پہلے کے خلفاء نے قصداً ایسے کام کیے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے برخلاف ہیں، اور اگر میں لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی پر مجبور کرنے کی کوشش کروں تو لوگ مجھے چھوڑ دیں گے اور مجھ سے روگردانی اختیار کرلیں گے (عسکری صفحہ ۳۷-۳۸) (سعید اسماعیل)

داخل ہونے کا عنوان ہے، اور اس کلمہ کو زبان سے ادا کر دینے والا - خواہ وہ حربی ہی کیوں نہ ہو - دنیا میں جان و مال کی حفاظت کا مستحق ہو جاتا ہے، رہا سوال آخرت میں نجات کا تو وہ ایمان سے حاصل ہوگی، اور ایمان کے لیے - جیسا کہ امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے - کچھ فرائض ہیں، کچھ شرائع ہیں اور کچھ حدود اور سنتیں ہیں، تو جو ان کو پورا پورا لے گا وہ کامل ایمان والا ہوگا، اور جو ان کو پورا پورا نہیں لے گا اس کا ایمان کامل نہیں ہوگا، اور ان حدود و شرائع وغیرہ میں شیعوں کے بارہویں امام کی تصدیق تک نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک موہوم شخصیت ہے، جو جھوٹے طریقے سے حسن عسکری پر چسپاں کر دی گئی ہے، جو کہ بے اولاد مرے تھے، اور اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ہی ان کے بھائی جعفر نے ان کا ترکہ پایا تھا، علویوں کا نوزائیدہ بچوں کے اندراج کا ایک رجسٹر ہے، جس کی نگرانی اس زمانے میں ''نقیب'' کے ذمے تھی کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کا اس رجسٹر میں اندراج ہوتا، حسن عسکری کے کسی لڑکے کا اس رجسٹر میں اندراج نہیں ہے، اور موجودہ زمانے کے علویوں کے علم میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ حسن عسکری کوئی نرینہ اولاد چھوڑ کر مرے ہوں، مگر جب حسن عسکری لاولد فوت ہوئے اور ان کے امامی پیروکاروں کے نزدیک سلسلۂ امامت موقوف ہو گیا، تو انھوں نے سوچا کہ ان کے مرنے کے بعد تو امامی شیعہ مذہب دم توڑ دے گا، اور کوئی امام نہ ہونے کی وجہ سے وہ غیر امامی ہو جائیں گے۔

فرقۂ نصیریہ کا انشقاق

تو ان کے شیطانوں میں سے ایک شیطان نے جس کا نام محمد بن نصیر تھا اور جو بنی نمیر کے موالی میں سے تھا، یہ نظریہ ایجاد کیا کہ حسن (عسکری) کے گھر کی سرنگوں میں ان کا ایک پوشیدہ لڑکا موجود ہے، محمد بن نصیر نے یہ نظریہ اس لیے ایجاد کیا تھا تاکہ وہ اور اس کے ساتھی شیعوں کے عوام اور ان کے دولت مندوں سے ایک موجود امام کے نام پر زکوٰۃ وصول کر سکیں، اور اپنے امامی ہونے کے دعوے کو غلط اور جھوٹے طریقے سے جاری رکھ سکیں، اور اس کا یہ مقصد بھی تھا کہ وہ اس خیالی سرنگ کا خود ساختہ اور اس کے شیعوں کے درمیان دروازہ بن جائے، اور اس طرح وہ ان سے زکوٰۃ کا مال وصول کر کے جمع کرتا رہے، لیکن اس کے تمام شیطان صفت دوست جو اس سازش میں اس کے

شریک تھے، اس معاملے میں (مال جمع کرنے کے معاملے میں) اس کے مخالف ہو گئے، اور اس بات پر اَڑ گئے کہ دروازہ ایک ایسا تیل فروش شخص ہوگا جس کی حسن عسکری کے گھر کے دروازے پر ایک دوکان ہے، اور حسن اور اس کے والد کے گھر والے اس سے اپنے گھریلو ضرورت کی چیزیں لیا کرتے تھے۔

دروازے اور سرنگ کی حکایت

ان کے درمیان جب یہ اختلاف رونما ہوا، تو یہ عقیدہ ایجاد کرنے والا (محمد بن نصیر) ان سے الگ ہو گیا، اور اس نُصیری مذہب کی بنیاد رکھی جو اس کی طرف منسوب ہے، اور اس کے جو ساتھی تھے وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے بارہویں خود ساختہ امام کو ظاہر کرنے کی کوئی تدبیر کریں، اور یہ کہ وہ امام شادی کریں تا کہ ان سے کوئی لڑکا پیدا ہو اور پھر پوتے ہوں، جو امامت کو سنبھال سکیں، اور ان کے ذریعے امامیہ کا مذہب جاری رہ سکے، لیکن یہ بات واضح تھی، کہ ان کے ظہور کو علویوں کے عہدۂ نقابۃ، تمام علویوں اور ان کے عم زاد خلفاء بنی عباس کی طرف سے تکذیب کا سامنا کرنا پڑے گا، لہذا انھوں نے یہ یہ خیال جاری کیا کہ وہ سرنگ میں موجود ہیں، اور ان کی ایک چھوٹی پوشیدگی ہے اور ایک بڑی پوشیدگی ہے، شروع سے آخر تک یہ پورا افسانہ ایسا ہے جو اس سے پہلے حتی کہ یونان کے افسانوں میں بھی نہیں سنایا گیا ہے، اور شیعہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمام مسلمان جن کو اللہ نے عقل کی دولت سے نوازا ہے اس جھوٹ کے پلندے کی تصدیق کریں، تا کہ ان کے درمیان اور شیعوں کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی ہو سکے۔ اور یہ ناممکن ہے ناممکن، الا یہ کہ پورا عالم اسلام دماغی اور ذہنی بیماریوں کے علاج کا ایک اسپتال بن جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے عقل کی نعمت سے نوازا ہے، کیونکہ عقل ہی کی بدولت آدمی کو مکلّف بنایا گیا، اور یہ ایمان کے صحیح ہونے کے بعد سب سے بڑی اور شریف ترین نعمت ہے۔

توسعہ علی العیال کی روایتوں کا علمی و تحقیقی جائزہ

از: مسعود احمد الاعظمی

''افکار عالیہ'' کے جولائی تا ستمبر کے شمارے میں مولانا رفیق احمد رئیس سلفی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے: ''عاشوراء کے دن کھانے پینے میں وسعت اختیار کرنے سے متعلق احادیث اور ان کی استنادی حیثیت''۔ مضمون نگار نے شروع میں لکھا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً اور ایک راوی ابراہیم بن محمد بن منتشر سے بلاغاً بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ذیلی عنوان ''زیر بحث حدیث کے مراجع اور ماہرین فن کے اس پر تبصرے'' کا قائم کر کے ان چھ روایتوں کے اکیاون مراجع ذکر کیے ہیں، اور غیر ضروری طور پر اس بحث کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ مضمون نگار نے ۵۱ حوالوں اور اہل علم وائمۂ حدیث کے اس روایت پر کلام کے بعد آخر میں فتاویٰ ابن تیمیہ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس سے اس حدیث کے موضوع یا ضعیف ومنکر ہونے کو ثابت کیا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے اگر چہ اپنے فتاویٰ میں اس حدیث کو بے اصل ثابت کرنے کے لیے پوری قوت صرف کی ہے، لیکن ان سے پہلے اور بعد کے بہت سے ماہرین فن اور اہل علم کو اس حدیث کو بے اصل قرار دینے میں تأمل ہے، اور ان کا رجحان اس کے ثبوت کی طرف ہے، مگر افسوس ہے کہ مضمون نگار نے ان محدثین اور اہل علم کا کلام نقل کرنے سے اغماض کیا ہے، یا اگر کیا بھی ہے تو اس انداز سے کیا ہے کہ اس سے اس کے ثبوت اور ان کے رجحان کا بخوبی اندازہ نہیں ہوتا، راقم الحروف اس حدیث کو کتب احادیث سے اس کو روایت کرنے والے صحابہ کے نام کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد اہل علم کا اس پر کلام نقل کر دینا چاہتا ہے۔

۱- اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم کبیر (۹۴/۱۰) اور امام بیہقی نے شعب الایمان (۳/ ۳۶۵) میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے، طبرانی کے الفاظ یہ ہیں: **مَنْ وَسَّعَ علی عیاله یوم عاشوراء لم یزل في سعةٍ سائرَ سنته**، یعنی جس نے عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال پر وسعت کی، وہ پورے سال کشادگی میں رہے گا۔

اس کے ایک راوی کا نام ہیصم بن شداخ ہے، جس کو اس نے اعمش سے روایت کیا ہے، ہیصم ایک ضعیف اور کمزور راوی ہے، اور اس کی اس حدیث کی نسبت علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد (۳/ ۱۸۹) میں لکھا ہے: **رواہ الطبراني في الکبیر، وفیه الهیصم بن الشداخ وهو ضعیف جداً** (یعنی اس کو طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے، اس کی سند میں ہیصم بن شداخ نام کا ایک راوی ہے اور وہ بہت کمزور ہے)

اس کو علامہ ابن الجوزی نے بھی اپنی موضوعات (۵۷۲/۲) میں روایت کیا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ عقیلی نے ہیصم کو مجہول کہا ہے، اور حدیث غیر محفوظ ہے، اور ابن حبان نے کہا ہے کہ **الهیصم روی الطامات لا یجوز الاحتجاج به**، یعنی ہیصم نے آفت کی باتیں روایت کی ہیں، اس سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا اہل علم کے علاوہ اور بھی لوگوں نے اس روایت پر کلام کیا ہے، لیکن اختصار کے پیش نظر ان ہی چند اقوال پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

۲- ابن الاعرابی نے اپنے معجم (۱۴۰/۱) طبرانی نے معجم اوسط (۴۳۲/۶) اور امام بیہقی نے شعب الایمان (۳۶۶/۳) میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے، معجم اوسط میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من وسع علی أهله في یوم عاشوراء أوسع الله علیه سنته کلها**، یعنی جو شخص اپنے گھر والوں پر عاشوراء کے دن کشادگی پیدا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر پورے سال کشادگی اور فراخی پیدا کرے گا۔

علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد (۱۸۹/۳) میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر یہ کلام کیا ہے: **رواہ الطبراني في الأوسط وفیه محمد بن إسماعیل الجعفری، قال أبو حاتم: منکر الحدیث**. یعنی اس کو طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں محمد بن اسماعیل جعفری

ہے، جس کو ابو حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے۔

مگر امام بیہقی کی سند میں محمد بن اسماعیل نہیں ہے اور اس کے تقریباً تمام رواۃ معتبر ہیں، بس اس میں یہ خرابی ہے کہ اس کے ایک راوی ایوب بن سلیمان بن مینا اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک راوی مبہم ہے۔

۳- بیہقی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب ہی کے اسی جلد اور صفحہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے: **مـن وَسَّـعَ عـلـى عياله وأهلهٖ يوم عاشوراء وسع الله عليه سائر سنته** یعنی جو شخص اپنے اہل وعیال پر عاشوراء کے دن کشادگی کرے گا، اللہ پاک اس کے اوپر تمام سال کشادگی کرے گا۔

بیہقی ہی کے حوالے سے اس کو حافظ منذری نے بھی ترغیب وترہیب (۱۱۶/۲) میں نقل کیا ہے۔

۴- بیہقی نے شعب الایمان ہی کے جلد ۳ صفحہ ۳۶۵، اور حافظ ابن عبد البر نے استذکار (۲۱۳/۳) میں اسی مضمون کی حدیث حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، شعب الایمان میں یہ حدیث کمزور سند سے روایت ہوئی ہے، چنانچہ اس کو روایت کرنے کے بعد خود امام بیہقی نے اس پر یہ حکم لگایا ہے کہ **هذا إسناد ضعيف** یعنی یہ سند کمزور ہے۔

لیکن استذکار میں اس کی سند بظاہر بہت قوی ہے، اس میں حضرت جابر سے روایت کرنے والے ابوالزبیر ہیں، ابوالزبیر سے شعبہ نے روایت کیا ہے، اور شعبہ سے ہشام بن عبدالملک طیالسی نے روایت کیا ہے، جو ابوالولید طیالسی کے نام سے مشہور ہیں، یہ سب صحاح ستہ کے راوی ہیں اور سب کے سب اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ ہشام سے روایت کرنے والے فضل بن حباب ہیں، جن کا تذکرہ حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء جلد نمبر ۱۴ صفحہ ۷ تا ۱۱ میں کیا ہے، اور اس کے آغاز میں لکھا ہے: **الإمـــــام العلامة، المحدث الأديب الأخباري، شيخ الوقت، أبو خليفة الفضل بن الحباب.**

پھر ذہبی نے تفصیل سے ان کے حالات، تحصیل علم اور روایت حدیث وغیرہ کا ذکر کیا ہے، ان کی نسبت یہاں تک لکھا ہے: **وكـان ثـقـةً صادقاً مأموناً، أديباً فصيحاً مفوّهاً، رُحِل إليه من الآفاق، وعـاش مـائـة عـام سـوى أشهر** (ج ۱۴/ص ۸) ثقہ تھے، سچے تھے، مامون تھے، ادیب، فصیح اور

زبان آور تھے، دور دراز کے علاقوں سے ان (سے علم حاصل کرنے) کے لیے سفر کیا گیا، تقریباً سو برس زندہ رہے۔

فضل بن حباب سے اس حدیث کو محمد بن معاویہ نے روایت کیا ہے، اور محمد بن معاویہ کا تذکرہ حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء جلد ۱۶ میں صفحہ ۶۸ پر کیا ہے، ان کا تذکرہ ذہبی نے ان شاندار الفاظ کے ساتھ شروع کیا ہے: **محدّث الأندلس، ومسندها الثقة أبوبكر محمد بن معاوية بن عبدالرحمن بن معاوية بن إسحاق بن عبدالله بن معاوية ابن الخليفة هشام بن عبدالملك ابن مروان الأموي المرواني القُرطبي، المعروف بابن الأحمر، من بيت الإمرة والحشمة.** یعنی اندلس کے محدث اور اس کے ثقہ راوی ابوبکر محمد بن معاویہ بن عبدالرحمٰن .... جو ابن الاحمر کے نام سے مشہور اور شاہی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آگے ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے: **وكان شيخاً نبيلاً، ثقةً، معمراً،** ثقہ، سن رسیدہ اور شریف بزرگ تھے۔ ان کا نہایت عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ ان ہی کی بدولت امام نسائی کی ''سنن کبیر'' کا نسخہ اندلس میں رواج پذیر ہوا، ذہبی نے لکھا ہے: **وجلب إليها "السنن الكبير" للنسائي، وحمل الناس عنه** (سیر، ج ۱۶، ص ۶۸) یعنی نسائی کی ''سنن کبیر'' کا نسخہ انھوں نے اندلس سے منگوایا، اور پھر ان ہی سے اس کو لوگوں نے حاصل کیا۔

محمد بن معاویہ سے اس کو حافظ ابن عبدالبر کے تین اساتذہ نے روایت کیا ہے۔ ہم ناظرین کی سہولت کے لیے استذکار سے اس حدیث کی پوری سند یہاں نقل کر دینا چاہتے ہیں، ملاحظہ ہو: **حدثنا أحمد بن قاسم، ومحمد بن إبراهيم، ومحمد بن حكم، قالوا: حدثنا محمد بن معاوية، قال: حدثنا الفضل بن الحباب، قال: حدثنا هشام بن عبدالملك الطيالسي، قال: حدثنا شعبة، عن أبي الزبير، عن جابر، قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول، الحديث.**

اس سند کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ شعبہ اور ابوالزبیر کے علاوہ تمام راویوں نے صیغۂ تحدیث کے ساتھ بیان کیا ہے، جس سے اس کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ حافظ ابن حجر نے لسان المیز ان میں فضل بن حباب کے تذکرے میں اس کی نسبت لکھا ہے: **روى ابن عبدالبر في الاستذكار من طريقه حديثاً منكراً جداً ما**

أدري من الآفة فيه کہ ابن عبدالبر نے استذکار میں فضل بن حباب کے طریق سے ایک بہت منکر حدیث روایت کی ہے، مجھے پتہ نہیں کہ اس میں آفت کون شخص ہے۔ پھر ابن حجر نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: کہ ابن عبدالبر کے تینوں اساتذہ کی توثیق کی گئی ہے، اور ان سب کے شیخ محمد بن معاویہ، نسائی سے ان کی سنن کو روایت کرنے والے ہیں، جن کی ابن حزم وغیرہ نے توثیق کی ہے، لہذا ظاہر یہ ہے کہ اس میں ابوخلیفہ سے غلطی ہوئی ہے۔ اور شاید ابن الاحمر نے ان سے اس کو ان کی کتابوں کے جلنے کے بعد سنا ہے۔

حافظ ابن حجر کی عبارت یہ ہے: **وشيوخ ابن عبدالبر الثلاثة موثقون، وشيخهم محمد بن معاوية هو ابن الأحمر راوي السنن عن النسائي وثقة ابن حزم وغيره. فالظاهر أن الغلط فيه من أبي خليفة، فلعل ابن الأحمر سمعه منه بعد احتراق كتبه، والله أعلم.**

مگر حافظ ابن حجر کے برعکس ان کے استاذ حافظ عراقی نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور مسلم کی شرط کے مطابق قرار دیا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔

۵- حافظ ابن حجر نے لسان المیز ان میں **يعقوب بن خُرّة الدَّبّاغ** کے تذکرے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اسی مضمون کی حدیث ذکر کی ہے، اس کو ذکر کرنے کے بعد ابن حجر نے دارقطنی کا یہ کلام نقل کیا ہے کہ: **منكر من حديث الزهري، وإنما يُروى هذا من قول إبراهيم بن محمد بن المنتشر، ويعقوب بن خرة ضعيف.**

اس کو علامہ ابن الجوزی نے بھی **العلل المتناهية** (۲/۵۵۲-۵۵۳) میں سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اور آخر میں دارقطنی کا کلام نقل کیا ہے۔

۶- ان مرفوع روایتوں کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی یہ حدیث روایت ہوئی ہے، استذکار (۳/۲۱۴) میں حضرت سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: **قال عمر بن الخطاب: من وسع على أهله يوم عاشوراء وسع الله عليه سائر السنة.**

۷- علاوہ ازیں استذکار میں یہ حدیث ابراہیم بن محمد بن منتشر کے مقولہ کے طور پر روایت ہوئی ہے، اور شعب الایمان (۳/۳۶۷) میں ابراہیم سے یہ منقول ہے کہ: **كان يقال من وسع**

علی عیاله یوم عاشوراء لم یزالوا في سعة من رزقهم سائر سنتهم. یعنی کہا یہ جاتا تھا کہ جو شخص عاشوراء کے دن اپنے بال بچوں پر کشادگی کرے گا، تو وہ لوگ پورے سال کشادہ حالی میں رہیں گے۔

مذکورہ بالا روایتوں میں سے ہر ایک پر الگ الگ کلام کو دیکھتے ہوئے بعض اہل علم نے ان کو یکسر نا قابل اعتبار قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات (۲/۵۷۲) میں حضرت ابن مسعود کی حدیث روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: **قال العقیلی: الهیصم مجهول والحدیث غیر محفوظ، وقال ابن حبان: الهیصم روی الطامات لا یجوز الاحتجاج به،** عقیلی نے کہا کہ ہیصم مجہول ہے: اور حدیث غیر محفوظ ہے، اور ابن حبان نے کہا ہے کہ ہیصم نے بڑی مصیبت کی باتیں روایت کی ہیں، اور ان سے استدلال جائز نہیں ہے۔

اور ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات نیز العلل المتناہیۃ (۲/۵۵۳) میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: **قال العقیلي: وسلیمان مجهول، والحدیث غیر محفوظ، ولا یثبت هذا الحدیث عن رسول الله ﷺ في حدیث مسند.** عقیلی نے کہا کہ سلیمان (حضرت ابو ہریرہ سے اس کو روایت کرنے والا سلیمان بن ابی عبداللہ) مجہول ہے، اور حدیث غیر محفوظ ہے اور یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی کسی مسند (مرفوع) حدیث میں ثابت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں حرب کرمانی کی ''مسائل'' سے ایک عبارت نقل کی ہے، جس سے امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کا بھی اس حدیث کو معتبر نہ ماننا معلوم ہوتا ہے۔

ان چند حضرات کو چھوڑ کر اکثر محدثین اور اہل علم اس حدیث کے مضمون کو ثابت مانتے ہیں، جن اہل علم کے اقوال تک اس وقت ہماری رسائی ہو سکی ہے، ذیل میں ان کو نقل کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے امام بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) کا فیصلہ ملاحظہ ہو، انھوں نے شعب الایمان (۳/۳۶۶) میں حضرت جابر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی روایتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: **هذه الأسانید وإن کانت ضعیفة، فهي إذا ضُمَّ بعضها**

إلی بعض أخذت قوة، والله أعلم، یہ سندیں اگرچہ کمزور ہیں، لیکن جب ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جائے، تو قوت حاصل کر لیتی ہیں، واللہ اعلم۔

بیہقی کے اس قول کو حافظ عبدالعظیم منذری (متوفی ۶۵۶ھ) نے بھی ترغیب وترہیب (۲/ ۱۱۶) میں نقل کیا ہے، جس سے ان کے نزدیک بھی اس کا قوی ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اور حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے **المقاصد الحسنة** (ص ۴۳۱) میں بیہقی کے قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

بـل قال العراقي في أماليه: لحديث أبي هريرة طرق صحح بعضها ابن ناصر الحافظ، وأورده ابن الجوزي في الموضوعات من طريق سليمان بن أبي عبدالله عنه، وقـال: سـليمان مجهول، وسليمان ذكره ابن حبان في الثقات، فالحديث حسن على رأيـه، قـال: ولـه طريق عن جابر على شرط مسلم أخرجها ابن عبدالبر في الاستذكار مـن رواية أبـي الـزبيـر عنه، وهي أصح طرقه، ورواه هو والدارقطني في الأفراد بسند جيد عن عمر موقوفاً عليه، والبيهقي في الشعب من جهة محمد بن المنتشر قال: كان يقال، فذكره.

یعنی عراقی نے اپنے امالی میں لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے کئی طریق ہیں، جن میں سے بعض کو حافظ ابن ناصر نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں سلیمان بن ابی عبداللہ کے طریق سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ سلیمان مجہول ہے۔ حالانکہ سلیمان کو ابن حبان نے ثقات [1] میں ذکر کیا ہے، لہذا ان کی (ابن حبان کی) رائے کے مطابق یہ حدیث حسن ہوگی۔ عراقی نے کہا کہ اس کا ایک طریق حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مسلم کی شرط کے مطابق ہے، اس کو ابن عبدالبر نے استذکار میں روایت کیا ہے، حضرت جابر سے اس کو ابوالزبیر نے روایت کیا ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی سند اس حدیث کی سندوں میں صحیح ترین ہے، نیز اس حدیث کو ابن عبدالبر (نے استذکار میں) اور دارقطنی نے ''افراد'' میں ایک عمدہ سند سے حضرت عمر سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں محمد

(۱) ابن حبان نے سلیمان کو کتاب الثقات (۳۱۲/۴) میں ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان بن ابی عبداللہ، ابن حبان کے نزدیک ثقہ راوی ہیں۔

ابن المنتشر سے اس طرح روایت کیا ہے کہ کہا یہ جاتا تھا کہ **من وسع علی عیاله، الحدیث.**

حافظ عراقی کے اس قول کو علامہ سیوطی نے بھی اللآلی المصنوعۃ (۱۱۲/۲) میں قدرے تفصیل سے نقل کیا ہے، اوران سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ: **وأما قول الشیخ ابن تیمیة أن حدیث التوسعة ما رواه واحد من الأئمة وإن أعلی ما بلغه من قول ابن المنتشر، فهو عجب منه کما تری، وقد جمعت طرقه في جزء.**

عراقی کہتے ہیں کہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ حدیث توسعہ کو ائمہ میں سے کسی نے روایت نہیں کیا ہے، اور زیادہ سے زیادہ جو بات اس سلسلے میں پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ یہ محمد ابن المنتشر کا قول ہے، تو ابن تیمیہ کی یہ بات تعجب خیز ہے، اور میں نے اس حدیث کے تمام طرق کو ایک جز میں جمع کر دیا۔ سیوطی نے لآلی میں صفحہ ۱۱۱ سے صفحہ ۱۱۴ تک اس مضمون کی مختلف روایتوں کو ان کے مالہ وماعلیہ کے ساتھ ذکر کر کے اس پر جو گفتگو کی ہے، اس سے ان کا رجحان بھی نفس حدیث کو ثابت ماننے کی طرف معلوم ہوتا ہے، چنانچہ انھوں نے مشہور مالکی امام عبدالملک بن حبیب کے چند اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: **وهذا من الإمام الجلیل دلیل علی صحة الحدیث والله أعلم**، یعنی اس عظیم المرتبت امام کے یہ اشعار حدیث کے صحیح ہونے پر دلالت کرنے والے ہیں، واللہ اعلم۔

اور سیوطی ہی نے جامع صغیر (مع فیض القدیر للمناوی) میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کو طبرانی کی معجم اوسط اور بیہقی کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد اس پر صحیح ہونے کی علامت لگائی ہے۔

عراقی، سخاوی اور سیوطی وغیرہ کی ان بحثوں کو علامہ ابن عراق (متوفی ۹۶۳ھ) نے **تنزیه الشریعة المرفوعة** (۱۵۷/۲-۱۵۸) اور عجلونی نے کشف الخفاء میں بھی نقل کیا ہے۔

علامہ شوکانی نے الفوائد المجموعۃ (ص:۳٦) میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: **وقد أطال الکلام علیه في اللآلی بما یفید أن طرقه یقوي بعضها بعضاً**، یعنی سیوطی نے لآلی میں اس حدیث پر طویل گفتگو کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے طرق ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

اور مولانا عبیداللہ مبارک پوری نے مرعاۃ المفاتیح (٦/٣٦٤) میں عراقی، ابن حجر، سخاوی اور

سیوطی وغیرہ کی بحثوں کوذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے: **والمعتمد عندي هو ما ذهب إليه البيهقي أن له طرقاً يقوي بعضها بعضاً، إن أسانيده الضعيفة أحدثت قوة بالتضام، والله تعالىٰ أعلم.** یعنی میرے نزدیک قابل اعتماد بات وہ ہے جس کو بیہقی نے اختیار کیا ہے کہ اس حدیث کے متعدد طرق ہیں جو ایک دوسرے کو قوت پہنچاتے ہیں، اس کی کمزور سندیں آپس میں مل کر قوت پیدا کر دیتی ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

رہا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا اس حدیث کو غیر صحیح کہنا تو اس کی نسبت علامہ ابن عراق نے تنزیہ الشریعۃ (۱۵۸/۲) میں لکھا ہے: **وقول الإمام أحمد "لا يصح": لا يلزم منه أن يكون باطلاً، كما فهمه ابن القيم، فقد يكون الحديث غير صحيح وهو صالح للاحتجاج به بأن يكون حسناً، والله تعالىٰ أعلم،** یعنی امام احمد رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ صحیح نہیں ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حدیث باطل ہے، جیسا کہ ابن القیم نے سمجھا ہے، کیونکہ کبھی کوئی حدیث غیر صحیح ہوتی ہے اس کے باوجود وہ استدلال کے لائق ہوتی ہے اس طرح سے کہ وہ حسن ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آخر میں عرض ہے کہ بہت سے بزرگوں کے نزدیک اس حدیث پر عمل درآمد فارغ البالی کا ایک مجرب نسخہ ثابت ہوا ہے، چنانچہ علامہ ابن عبدالبر نے استذکار میں حضرت جابر، شعبہ، یحیٰ بن سعید اور سفیان ابن عیینہ وغیرہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: **جرّبناه، فوجدناه كذلك،** کہ ہم نے اس کا تجربہ کیا تو اس کے مطابق پایا۔

ہمارے بعض علماء سے بھی اس سلسلے میں عجیب وغریب ذہول ہوا ہے، راقم کی یہ تحریر مکمل ہونے کے بعد مدرسہ مرقاۃ العلوم کے استاذ مفتی جاوید احمد صاحب نے "احسن الفتاویٰ" جلد اول صفحہ ۳۹۵ دکھائی، اس میں مرقوم ہے: "بعض کا اس حدیث کو ضعیف کہنا صحیح نہیں، یہ حدیث بلا شبہہ صحیح ہے، مع ہذا اس بنا پر اس سے احتراز کرنا چاہئے کہ لوگ اس کو ثواب سمجھتے ہیں، حالانکہ شریعت نے اس میں ثواب نہیں بتایا، اسے ثواب سمجھنے سے یہ کام بدعت بن جائے گا" الخ۔ مجھے حیرت اس پر ہے کہ اگر احسن الفتاویٰ کے مصنف کی نگاہ میں "یہ حدیث بلا شبہہ صحیح ہے" تو اس حدیث پر عمل کرنے سے ثواب کیوں نہیں حاصل ہوگا؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کرنا بقیہ صفحہ ۵ پر

بقیع کے فضائل اور معروف صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کا تذکرہ

تحریر: جمال الدین محمد بن احمد المطری　　ترجمہ: مولانا انور رشید الاعظمی استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

(پانچویں قسط)

حضرت عطاء بن یسار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان کے یہاں جب رات گذارنے کی باری ہوتی تو آنحضور ﷺ آخرِ شب میں ان کے یہاں سے نکل کر بقیع تشریف لے جاتے اور وہاں پہنچ کر یوں سلام کرتے تھے، **السلام علیکم دار قوم مؤمنین، وأتاکم ما توعدون، غدا مؤجلون وإنا إن شاء اللّٰہ بکم لاحقون، اللّٰھم اغفر لأھل بقیع الغرقد**[1]، (قتیبہ بن سعید اور یحیٰ بن ایوب اس حدیث کے راویوں میں ہیں، یحیٰ نے ''وأتاکم'' کے ساتھ روایت کیا ہے، قتیبہ کی روایت ''وأتاکم'' کے بغیر ہے۔

محمد بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ آپ فرمارہی تھیں کہ میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اور اپنی جانب سے حدیث نہ بیان کروں؟

محمد بن قیس ہی سے ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں کہ انھوں نے ایک روز فرمایا کہ: میں تم لوگوں کو اپنی طرف سے اور اپنی ماں کی طرف سے حدیث نہ بیان کروں؟ محمد بن قیس سے روایت کرنے والے نے کہا کہ ہم نے یہ خیال کیا ان کے اس قول سے حقیقی ماں مراد ہیں، اس لیے ہم نے کہا کہ ضرور فرمائیں، وہ کہتے ہیں کہ (میری ماں) فرماتی ہیں کہ جب وہ رات آئی جس میں رسول اللہ

---

(۱) غرقد: ایک چھوٹا درخت ہے جو کانٹے دار درخت کے مشابہ ہے، یہاں بقیع سے مراد شہر مدینہ کا بقیع ہے جو مسجد نبوی کے مشرق میں عہد نبوی میں واقع تھا اور اب بھی ایسا ہی ہے، اس درخت کی نسبت سے اس کی شہرت ہوئی۔

ﷺ میرے پاس ہوتے تھے، تو آپ واپس آئے اور اپنی چادر رکھی، اور جوتے نکالے اور انھیں اپنے دونوں پیروں کے پاس رکھ دیا، اپنے ازار کا کنارہ اپنے بستر پر بچھایا اور لیٹ گئے، پھر اتنی دیر ٹھہرے رہے کہ آپ کو میرے سونے کا یقین ہو گیا پھر آپ نے آہستہ سے چادر لی اور آہستہ سے جوتا پہنا، دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے اور آہستہ سے دروزہ بھیڑ دیا اور میں نے اپنا کرتہ اپنے سر پر رکھ لیا اور دوپٹہ کی طرح اوڑھ لیا، اور اپنا ازار لپیٹ لیا، پھر آپ ﷺ کے پیچھے چلی یہاں تک کہ آپ بقیع تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو گئے اور کافی دیر تک کھڑے رہے، پھر اپنے دونوں ہاتھ تین مرتبہ اٹھائے، پھر واپس ہوئے تو میں بھی واپس ہوئی، پھر تیزی سے چلے تو میں بھی تیز چلی، پھر دوڑے تو میں بھی دوڑی اور آپ سے آگے بڑھ گئی اور گھر میں داخل ہو گئی، ابھی میں لیٹی ہی تھی کہ آپ ﷺ داخل ہوئے اور فرمایا کہ کیا ہوا کہ تم اتنا زیادہ ہانپ رہی ہو، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کوئی بات نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمھیں مجھ کو بتا دینا چاہیے ورنہ وہ ذات مجھے خبر کر دے گی جو بڑی باریک بیں اور بہت باخبر رہنے والی ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اور میں نے ساری بات بتا دی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو وہ سیاہی تم ہی تھی جسے میں نے اپنے سامنے دیکھا تھا، میں نے کہا کہ جی میں ہی تھی، اس پر آپ ﷺ نے میرے سینہ پر ایسا مکا مارا کہ مجھے درد محسوس ہوا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر ظلم کریں گے؟ انھوں نے عرض کیا کہ لوگ کتنا ہی چھپائیں گے اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے باخبر کر دیں گے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام میرے پاس اس وقت تشریف لائے جس وقت تم نے دیکھا، پھر انھوں نے اس انداز سے مجھے آواز دی کہ تم سے پوشیدہ رکھا، میں نے جواب دیا تو میں نے بھی تم سے مخفی رکھا، تم نے اپنے کپڑے ہٹا رکھے تھے اس لیے وہ داخل نہیں ہوئے، اور میں نے سمجھا کہ تم سو گئی ہو اس لیے تم کو جگانے سے گریز کیا، اور مجھے ڈر لگا کہ تم وحشت محسوس کرو گی، پھر انھوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ کا رب آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اہل بقیع کے پاس آئیں اور ان کے حق میں استغفار کریں، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں ان کے حق میں کیسے

دعاء کروں؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم یوں کہو: **السلام عليكم أهل الديار من المؤمنين والمسلمين ويرحم الله المستقدمين منا والمستأخرين وإنا إن شاء الله بكم لاحقون.**

ابو عاصم کہتے ہیں کہ ام قیس بنت محصن نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ کاش کہ تم نے مجھے اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہوتا کہ مدینہ کی گلی میں میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ بقیع پہنچے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ام قیس، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں اور آپ کی خدمت کے لیے بار بار حاضر ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم یہ مقبرہ دیکھ رہی ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں اے اللہ کے رسول میں دیکھ رہی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس میں سے ستر ہزار ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوں گے، اور جنت میں بغیر حساب کتاب کے داخل ہوں گے۔

عبدالرحمٰن بن ابوالزیاد اپنے والد ابوزیاد سے وہ اعرج سے اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے میرے لیے زمین شق ہوگی، اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جو زمین سے نکلے گا، میں اور ابوبکر وعمر اہل بقیع کی طرف نکلیں گے، اور سب اٹھائے جائیں گے، پھر اہل مکہ کو اٹھایا جائے گا، اور میں حرمین کے درمیان اٹھایا جاؤں گا۔

حِکام ابوعبداللہ شامی ابوعبدالملک سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ان سے ایک مرفوع حدیث بیان کی جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ آسمان والوں کے لیے دو مقبرے روشن ہوں گے ایسے ہی جس طرح زمین والوں کے لیے سورج و چاند روشن ہوتے ہیں، ایک تو بقیع مدینہ ہے اور دوسرا عسقلان [1] کا مقبرہ ہے۔

عیسیٰ بن عبداللہ اپنے والد عبداللہ سے روایت کرتے ہیں، ان کے والد کہتے ہیں کہ کعب احبار کہتے ہیں کہ ہم نے توراۃ میں یوں دیکھا ہے کہ وہ ایک ایسے گنبد کی شکل میں ہے جو کھجور کے درختوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فرشتوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، جب وہ بھر جاتا ہے تو وہ فرشتے اس

(۱) عسقلان: فلسطین کا ایک مشہور شہر ہے۔

کے کناروں کو پکڑ کر جنت کے اندر اوندھا کر کے ڈال دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ان کی مراد بقیع ہے۔

ابن کعب قرظی سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: کہ ہم نے جس کو اپنے اس مقبرہ (بقیع) میں دفن کیا تو اس کی سفارش کریں گے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں نیز آپ کے وصال کے بعد وفات پانے والے اکثر صحابہ بقیع کے اندر مدفون ہیں، اسی طرح سادات اہل بیت اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی مدفون ہیں، مزید رسول اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات امہات المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ماسوا بھی اس کے اندر مدفون ہیں، کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں اور حضرت میمونہ مقام سرف (۱) میں ہیں، مگران کی قبروں کے نشانات معلوم نہیں ہوتے، البتہ رسول اکرم ﷺ کے چچا ابوالفضل عباس رضی اللہ عنہ، اور ابو محمد حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قبروں کے آثار ملتے ہیں، حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ جس وقت انھیں موت کے قریب ہونے کا احساس ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے میری والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں دفن کرنا، چنانچہ ان کی قبر ان کی والدہ کی قبر کے پاس ہوگی، رضوان اللہ علیہم اجمعین، ایک دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبر ان کے مکان میں تھی جس کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد نبوی میں شامل کر دیا، شیخ محبّ الدین طبری نے ''ذخائر العقبیٰ في فضائل ذوي القربیٰ'' میں جو انھیں کی تصنیف ہے، یہ بیان کیا ہے کہ مجھے میرے ایک مسلمان بھائی نے یہ خبر دی ہے کہ شیخ ابوالعباس مرسی، جب بقیع کی زیارت کرتے تھے تو قبۃ العباس کے سامنے کھڑے ہوتے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر سلام پڑھتے تھے، اور کہا جاتا ہے کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبر شریف ہے (واللہ اعلم)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے بھتیجے علی بن حسین زین العابدین، اور ان کے صاحبزادے حضرت باقر، اور ان کے صاحبزادے جعفر بن محمد الصادق ہیں، اور ان کے اوپر ایک بلند قبہ ہے جس کو خلیفہ ابوالعباس احمد بن المستضیئ الناصر نے تعمیر کیا تھا۔

پھر حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قبر ہے اور اسی قبر میں ان کے بھتیجے عبداللہ بن جعفر ابی

(۱) سرف: مکہ کے شمال میں ایک بلند مقام ہے جہاں نبیٔ کریم ﷺ نے حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے ساتھ پہلی رات گذاری تھی اور وہیں ان کی وفات بھی ہوئی۔

طالب رضی اللہ عنہ ہیں، اوران کے اوپر بھی ایک گنبد ہے، اور یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عقیل کی قبران کے مکان میں ہے، پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک ہے، اس پر بھی ایک گنبد ہے جس میں جانب قبلہ ایک روشن دان ہے اور وہ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے پہلو میں سپرد خاک ہیں، جیسا کہ صحیح روایت میں ہے کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام صاحبزادۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، لوگوں نے پوچھا کہ ان کی قبر کہاں کھودی جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے پیش رو حضرت عثمان کے پاس، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی یہ وارد ہے کہ جس وقت ان پر موت کے آثار ظاہر ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہلا بھیجا کہ اپنے اصحاب (یعنی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت عمر) کے پاس آجایئے، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں آپ کے گھر میں تنگی نہیں کروں گا اس لیے کہ میں نے اور حضرت عثمان بن مظعون نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ہم میں سے جس کی بھی وفات ہوگی وہ اپنے ساتھی کے پہلو میں دفن کیا جائے گا، اس لیے مجھے عثمان کے پہلو میں دفن کرو۔ چنانچہ انھیں ان کے پہلو میں دفن کیا گیا، اس صورت میں حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کی بھی زیارت ہوتی ہے۔

حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کے گنبد میں پتھر سے بنی ہوئی ایک دیوار ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی قبریں ہیں، ان پر سلام پڑھنا چاہیے، پھر امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر ہے، جو بقیع کے مشرق میں اس مقام پہ ہے جسے حش کوکب (۱) کہا جاتا ہے، اس پر ایک بلند گنبد ہے جسے صلاح الدین ایوبی کے ایک امیر اسامہ بن سنان صلاحی نے ۶۰۱ھ میں تعمیر کیا تھا۔

اس کے بعد امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی والدہ کی قبر ہے، وہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف رضی اللہ عنہا ہیں، یہ قبر بقیع کے آخر قبۂ عثمان رضی اللہ عنہ کے شمال میں اس مقام پر ہے جو حمام سے معروف ہے اور اس پر ایک چھوٹا سا گنبد ہے۔

پھر زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کی قبر ہے جو باب مدینہ سے نکلنے والے کے بائیں واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے مکان کے نزدیک وضو خانہ کے پاس

---

(۱) حش کوکب: وہ مقام ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدفون ہیں، اور موجود توسیع سے قبل بقیع کے شمال شرقی میں واقع تھا، اور خضراء ابان سے معروف ہے، روحاء بھی کہا جاتا ہے، یہ علاقہ عہد اموی کے شروع میں بقیع میں داخل ہو گیا۔

مدفون ہیں، جس پر پتھر کی عمارت ہے، لوگوں نے اس عمارت پر گنبد بنانا چاہا مگر اس عمارت کے دیوار اور دروازہ سے قریب ہونے کی بنا پر اس پر اتفاق نہ ہوسکا۔

پھر امام دارالہجرت امام ابوعبداللہ مالک بن انس کی قبر ہے، ایک چھوٹے گنبد میں ہے جو شخص باب مدینہ سے نکلے گا تو جانب مشرق اس کے بالمقابل ہوگی، اس کے بعد اسماعیل بن جعفر صادق کی قبر ہے جو ایک بڑے سفید قبرستان میں واقع ہے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گنبد کے مغربی جانب، قبلی اور مشرقی جانب سے مدینہ کے شہر پناہ کے کنارے واقع ہے، اس کا دروازہ مدینہ کے اندر سے ہے، اس کی تعمیر مصر کے بعض عبدی[1] بادشاہوں نے کی ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ صحن جس میں یہ قبرستان ہے، اور اسی طرح جانب شمال میں باب مدینہ تک صحن کے آس پاس کا علاقہ زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہما کا مکان تھا، اور باب اول اور قبرستان کے دروازہ کے درمیان ایک کنواں تھا جو زین العابدین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب تھا، اسی طرح قبرستان کے مغربی جانب ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو غیر آباد تھی اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ زین العابدین رضی اللہ عنہ کی مسجد تھی، ان مذکورہ قبروں کے علاوہ سلف صالحین میں سے کسی کی معروف ومشہور قبر نہیں ہے۔

مدینہ کے شمال میں شامی حجاج کے راستہ پر مدینہ کی شہر پناہ کے باہر محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قبر ہے، جنھیں ابوجعفر منصور کے دور خلافت میں شہید کردیا گیا، یہ جبل سلع کے مشرق میں واقع ہے اور اس پر ایک بڑی عمارت ہے جو پتھر سے بنائی گئی ہے، لوگوں نے اس عمارت پر بھی گنبد بنانا چاہا مگر اس پر ان کا اتفاق نہ ہوسکا، یہ ایک بڑی مسجد کے اندرونی حصہ میں ہے، یہ مسجد بھی غیر آباد ہے، اس میں محراب بھی ہے مسجد کے قبلہ والی سمت میں عین ازرق نامی ایک چشمہ ہے جو شہر مدینہ سے باہر ہے اس پر ایک مدرج عمارت ہے جس پر مشرقی ومغربی سمت سے سیڑھیاں ہیں، درمیان میں وہ چشمہ ہے جو اس حوض کی جانب بہتا ہے جہاں سے جاری ہوا ہے، حجاج اپنی آمد ورفت کے موقع پر اس چشمہ پر آتے ہیں۔

---

(۱) عبداللہ کی طرف نسبت کر کے عبدی کہا جاتا ہے۔

احد کے فضائل اور شہداء احد کا بیان احادیث کی روشنی میں

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ[1] انصاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے لیے ایک غلام تلاش کرو جو میری خدمت میں رہے، چنانچہ ابوطلحہ مجھے اپنے پیچھے سوار کرکے لے جاتے اور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بوقت قیام خدمت کیا کرتا تھا، مزید بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری جانب توجہ فرمائی یہاں تک کہ جب احد پہاڑ سامنے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم کو محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں، پھر جب مدینہ سے قریب تشریف لائے تو فرمایا کہ اے اللہ میں نے مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیانی حصہ کو حرم قرار دیا جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا، اے اللہ اہل مدینہ کے مُد اور صاع میں برکت نازل فرما، (مسلم و بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ احد وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اُحد جنت کے گوشوں میں سے ایک ہے۔

ابن جابر بن عتیک اپنے والد جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ حضرت موسی اور ہارون علیہما السلام حج یا عمرہ کے لیے نکلے، جب وہ مدینہ میں تشریف فرما تھے تو ہارون علیہ السلام بیمار ہوگئے، اور سخت بیمار ہوئے، موسی علیہ السلام کو ان کے بارے میں یہودیوں سے خوف لاحق ہوا چنانچہ انھیں احد کے پاس لے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ رب العزت نے جبل طور سیناء

---

(۱) ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا نام زید بن سہل بن الاسود خزرجی انصاری ہے، جلیل القدر صحابی ہیں، کنیت سے مشہور ہیں متعدد غزوات میں شریک تھے جنگ احد میں رسول اکرم کے سامنے تیر اندازوں میں سے ایک تھے، اپنا سینہ اوپر اٹھائے ہوئے تھے تاکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مشرکین کے تیروں کو پہنچنے سے روک سکیں، لمبی عمر پائی، اور اموی خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ سمندر میں جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

(۱) پر جس وقت تجلی فرمائی تو اس پہاڑ کے بہت سے ٹکڑے ہوئے، ان میں سے تین (حراء (۲)، ثبیر، (۳) ثور (۴)) مکہ میں اور (احد (۵)، عیر، اور ورقان (۶)) مدینہ میں گرے۔

میں کہتا ہوں کہ اُحد تو مشہور ہے، اور عیر مدینہ کی قبلی سمت میں اس کے مقابل ہے، مدینہ ان دونوں کے درمیان ہے، ورقان شعب علی (۷) کے سامنے ہے، قبلہ کی سمت میں شعب اور روحاء کے درمیان، جبل احد کے سامنے ان شہداء کی قبریں ہیں جو جنگ احد کے دن رسول اکرم ﷺ کے سامنے شہید ہوئے، ان میں سے بجز حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور کسی کی قبر معلوم نہیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے بھانجے عبداللہ بن جحش بھی اسی قبر میں مدفون ہیں، قبر کے اوپر ایک اونچا گنبد (۸) ہے اور مضبوط مقبرہ بھی، جسے ناصر لدین اللہ ابوالعباس احمد بن مستضی کی والدہ نے ۵۹۰ھ میں تعمیر کیا تھا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مشہد کے شمال میں ایسے پتھر ہیں جو راستوں اور قبروں پر بطور علامت لگائے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ شہداء کی قبروں کے پتھر ہیں، مشہد کے مغربی حصہ میں بھی ایسے ہی پتھر ہیں ان کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ شہداء کی قبروں کے ہیں، مگر اس کا صحیح ہونا مشتبہ ہے، البتہ مغازی کی بعض کتابوں میں یہ آیا ہے کہ یہ قبریں ان لوگوں کی ہیں جن کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد

---

(۱) طور سیناء: ایک بڑا صحراء ہے جو بحر احمر اور بحر متوسط کے درمیان جزیرہ نما سینا کے نام سے مشہور علاقہ تک پہنچتا ہے، کوہِ طور اس کے جنوب میں واقع ہے، یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تجلی فرمائی، قرآن میں اس نام سے ایک سورہ بھی ہے۔

(۲) مکہ کے شمال میں واقع مشہور پہاڑ ہے اسی پہاڑ میں غار حراء واقع ہے جس میں قبل نبوت نبی کریم ﷺ عبادت فرماتے تھے، آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

(۳) منی سے قریب مکہ کے مشرق میں واقع ہے، جبل مزدلفہ کو جبل ثبیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یاقوت حموی کا بیان ہے کہ مکہ میں متعدد پہاڑ ہیں جو ثبیر کہلاتے ہیں۔

(۴) ایک بڑا پہاڑ ہے جو مکہ کے جنوب میں واقع ہے، نبی اکرم ﷺ نے جس وقت مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا تو اسی غار میں اپنے رفیق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ قریش کے تعاقب سے بچنے کے لیے روپوش ہوئے تھے، آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

(۵) احد مدینہ منورہ کا مشہور پہاڑ ہے، عیر اس کے مقابل ہے۔

(۶) ورقان: حجاز کا ایک مشہور پہاڑ ہے، جو بہت ہی بلند ہے، اس کی اونچائی دور سے نظر آتی ہے۔

(۷) وادی بنی سالم کے علوی حصہ میں واقع ہے، اس وقت یہ غیر معروف ہے، ممکن ہے کہ یہ وہ جگہ ہو جو مدینہ آنے والے شخص کے راستہ میں دائیں جانب شعب کے نام سے مشہور ہے۔

(۸) سعودی حکومت نے اس گنبد کو اور اس جیسی بہت سی نشانیاں ختم کر دی ہیں۔

خلافت میں رمادہ(۱) والے سال میں انتقال ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہداء احد کی قبریں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے آس پاس ہیں اُن سے دور ہونے کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا، ان کے پاؤں کے پاس بھی ایک قبر ہے جس کے بارے میں کسی کو ادنی شک بھی نہیں ہوتا کہ کسی شہید کی قبر ہے، بلکہ وہ ایک ترکی شخص کی قبر ہے، وہ مشہد کی عمارت کا متولی تھا، اس کا نام سنقر تھا، وہیں انتقال ہوا لہٰذا وہیں دفن بھی ہوا، اسی طرح مشہد کے صحن میں دروازہ کے پاس بھی ایک قبر ہے جس میں اشراف مدینہ میں سے بعض اُمراء مدفون ہیں، جبل احد کے نیچے قبلہ کی سمت جبل سے متصل ایک چھوٹی مسجد تھی جس کی عمارت منہدم ہوگئی، کہتے ہیں جنگ احد ختم ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں ظہر اور عصر کی نماز پڑھی تھی، اس مسجد کے جانب قبلہ پہاڑ کے اندر انسانی سر کے برابر کھودی ہوئی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس چٹان پر جو اس کے نیچے ہے، بیٹھے تھے، اسی طرح مسجد کے شمالی حصہ میں پہاڑ کے اندر ایک غار ہے، عوام میں مشہور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اندر تشریف لے گئے ہیں، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس طرح کی باتوں کا صحیح ہونا ثابت نہیں اس لیے یہ ناقابل اعتماد ہیں۔

مشہد حمزہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک چھوٹا پہاڑ ہے جس کا نام عینین ہے اور ان کے درمیان وادی ہے جس پر جنگ احد کے دن تیر انداز تھے، وہاں دو مسجدیں بھی ہیں، ایک مشرقی گوشہ میں، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نیزہ لگا تھا، وہاں ایک نیا چشمہ تھا، جس کی تجدید والی مدینہ امیر بدرالدین وُدَی(۲) بن جماز نے کی تھی، اس چشمہ کا منبع و سرچشمہ اس مسجد سے قریب تھا، دوسری مسجد اس مسجد کے شمال میں وادی کے کنارے پر واقع ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسی مقام پر شہید کیے گئے، نیزہ لگنے کے بعد آپ نیزہ سمیت وہاں تک گئے، پھر گرے اور شہید ہوگئے، مشہد حمزہ رضی اللہ عنہ اور مدینہ کے درمیان ساڑھے تین میل یا اس کے قریب فاصلہ ہے، اور جبل احد تک مدینہ سے ۴ میل کے قریب فاصلہ ہے، واللہ اعلم۔

---

(۱) سنِ رمادہ: اس لیے کہا جاتا ہے کہ لوگ مثل رمادہ (راکھ) ہوگئے تھے، یہ ایک ایسا قحط تھا جس میں لوگوں کے رنگ متغیر ہوکر مثل راکھ ہوگئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں یہ قحط پڑا تھا، ایک قول یہ بھی کہ آپ کے عہد میں کئی سال یہ واقعہ پیش آیا۔

(۲) جنگ وجدل اور یورش کے بعد مدینہ کی امارت حاصل کی تھی، پھر ۴ سال قید میں رہے پھر ۷۴۱ھ اور ۷۴۳ھ کے درمیان دوبارہ امارت حاصل کی، اس کے چند ہی سال بعد ۷۴۵ھ میں انتقال ہوا، صاحب عقل وبصیرت اور بہادر تھا۔

اسلامی کیلینڈر ''سن ہجری''

مولانا ہلال احمد مالیگاؤں

[مضمون اسلامی کیلینڈر ''سن ہجری''، سیرت المصطفٰے، تاریخ طبری، الفاروق، دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اسلامی انسائکلو پیڈیا) پنجاب وغیرہ سے مراجعت کر کے مرتب کیا گیا ہے۔]

انسانی زندگی پانچ شعبوں پر منقسم ہے (۱) عقائد (۲) عبادات (۳) اخلاق (۴) معاشرت (۵) معاملات۔ اللہ رب العزت نے انسان کو تمدنی زندگی کا خوگر بنایا ہے اور اُس کی تحسین کی گئی ہے۔ آج کل تو زمانہ گلوبلائزیشن کا ہے۔ چند لمحوں میں خبریں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہیں، جس سے معاشرت اور معاملات فوراً متاثر ہوتے ہیں۔ جب تعلقات اور معاملات وسیع ہوتے ہیں، ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچتے ہیں تو معاملات کے سمجھنے کیلئے کچھ مشترکہ اُمور کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان اُمور میں سے مشترکہ تاریخ اور مشترکہ سنوات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ زمانہ قدیم ہی سے دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف سنوات رائج رہے ہیں۔ مثلاً عرب میں سنہ وتاریخ کی ابتداء کبھی حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالنے کے واقعہ سے ہوئی، کبھی تعمیر کعبہ سے ہوئی اور کبھی واقعہ فیل سے۔ لیکن دنیا کے یہ سنوات مستقل نہیں رہے، ان میں ترمیم ہوتی گئی۔ فی زمانہ چند سنوات ایسے ہیں جو بڑے علاقوں میں رائج ہیں مثلاً سنہ ہجری، سنہ عیسوی، ہندوؤں میں سنہ وکرمی (راجہ بکرماجیت سے) وغیرہ۔ اسلامی سنہ ہجری فی الحال ۱۴۳۸ھ ہے (آج ان شاء اللہ سنِ ہجری ۱۴۳۹ کی ابتداء ہے)، عیسائیوں میں سنہ عیسوی ۲۰۱۷ ہے اور ہندوؤں میں بکرماجیتی کلینڈر (وکرمی) ۲۰۷۴ ہے، اور اس میں بھی کچھ اختلاف ہے۔ عام انسان کے ذہن میں ان سنوات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہندوؤں میں جو بکرماجیتی سنہ رائج ہے وہ سب سے پہلے تدوین کیا گیا، اُس کے بعد سنہ عیسوی اور اُس کے بعد سنہ ہجری تدوین کیا گیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

ان سنوات میں بہت سی ترمیمات کی گئیں اور ابھی جو یہ سنوات رائج ہیں یہ زمانہ قدیم سے نہیں ہیں۔ مختصراً ان کی تاریخ ملاحظہ ہو۔

وکرمی سن:- یہ وکرمی سن جو بہت سی ترمیمات کے بعد ابھی رائج ہے، اس کے ساتھ ہندوؤں کے مختلف مکاتب فکر میں مختلف سنوات ہیں۔ یہ سنہ بظاہر سنہ ہجری سے ۶۷۸ سال پہلے کا معلوم ہوتا ہے، لیکن بہت سی ترمیمات کے بعد سب سے پہلے سمت ۸۹۸ میں یہ سنہ بکرمی کے نام سے مشہور ہوا، اس طرح بطور تدوین یہ سنہ، سنہ ہجری سے ۲۲۵ سال بعد مدون ہوا۔

عیسوی سن:- اسی طرح سنہ عیسوی کی تاریخ اس طرح ہے کہ یکم محرم ۱ھجری کو جولین کلینڈر ۱۶/ جولائی ۶۲۲ عیسوی تھا، مگر یہ سنہ ۹۸۹ ہجری میں تمام ترمیمات کے بعد سنہ عیسوی میں تبدیل ہوا۔ اور اس میں مزید ترمیمات ہوتی گئیں یہاں تک کہ ۴/ ذی القعدہ ۱۱۶۵ ہجری کو ۴/ ستمبر ۱۷۵۲ عیسوی بنا دیا گیا۔ اس طرح سنہ عیسوی سنہ ہجری کے ۹۸۹ سال بعد رائج ہوا۔

مختصراً یوں سمجھئے کہ بکرما جیتی سنہ (وکرمی) ۲۲۵ھ ہجری کے بعد رائج ہوا، اور سنہ عیسوی ۹۸۹ھ ہجری کے بعد رائج ہوا۔ اس طرح سنہ ہجری سب سے قدیم سنہ ہے، جو روزِ اول سے آج تک بغیر ترمیم کے رائج ہے۔

تاریخ اسلامی کی ابتداء

دنیا کے جمیع اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ سن ہجری کی ابتداء واقعہ ہجرت سے ہوئی، اور خلیفہ راشد ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوئی۔ اور یہ بات بھی مشہور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ ربیع الاول میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔ چنانچہ سیرت المصطفیٰ میں تحریر ہے کہ "محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر قباء میں رونق افروز ہوئے وہ دوشنبہ کا روز تھا اور تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳ھ نبوی تھی اور علماء سیر کے نزدیک آپ مکہ مکرمہ سے بروز پنجشنبہ ۲۷ صفر المظفر کو برآمد ہوئے تین شب غارِ ثور میں رہ کر یکم ربیع الاول بروز دوشنبہ مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور ساحل کے راستہ سے چل کر ۸ ربیع الاول بروز دوشنبہ دوپہر کے وقت آپ نے قباء میں نزول اجلال فرمایا"۔

نیز یہ بھی تحریر ہے کہ " شعبی اور محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ کر بھیجا کہ آپ کے فرمان ہمارے پاس پہنچتے ہیں لیکن اس پر تاریخ نہیں ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ میں صحابہ کو تعیین تاریخ کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے مدعو کیا، بعض نے یہ کہا کہ تاریخ کی ابتداء بعثت نبوی سے ہونی چاہیے اور بعض نے ہجرت سے اور بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تاریخ کی ابتداء ہجرت سے ہونی چاہیے، اس لئے کہ ہجرت سے ہی حق اور باطل میں فرق قائم ہوا اور ہجرت ہی سے اسلام کی عزت اور غلبہ کی ابتداء ہوئی۔ بالاتفاق سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ قیاس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ سن ہجری کی ابتداء ربیع الاول سے ہوتی، اس لئے کہ آپ اس ماہ میں مدینہ منورہ رونق افروز ہوئے، لیکن بجائے ربیع الاول کے محرم سے اس لئے ابتداء کی گئی کہ آپ ہجرت کا ارادہ محرم ہی سے فرما چکے تھے۔ انصار نے عشرۂ ذی الحجہ میں آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور اخیر ذی الحجہ میں حج کر کے مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ آپ نے ان کی واپسی کے چند روز کے بعد ہی ہجرت کا ارادہ فرمایا اور حضرات صحابہ کو ہجرت کی اجازت دی۔ اس لئے سن ہجری کی ابتدأ محرم الحرام سے کی گئی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہی مشورہ دیا کہ سن ہجری کی ابتدأ محرم الحرام سے ہونی چاہئے۔ بعض نے کہا رمضان المبارک سے ابتدأ ہونی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا محرم الحرام ہی مناسب ہے، اس لئے کہ لوگ حج سے اسی مہینے میں واپس ہوتے ہیں۔ اسی پر اتفاق ہوگیا۔ (بابُ التاریخ فتح الباری ج ۷ ص ۲۰۹/ تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۵۲/ زرقانی ج ۱ ص ۳۵۲/ عمدۃ القاری ج ۸ ص ۱۲۸)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کی تفسیر میں مروی ہے کہ ''الفجر'' سے محرم کی فجر مراد ہے جس سے سال کی ابتدأ ہوتی ہے''۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ سیر کبیر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ جب عمر رضی اللہ عنہ نے تعین تاریخ کے بارے میں صحابہ کو جمع کیا تو بعض نے یہ مشورہ دیا کہ تاریخ کی ابتداء ولادت باسعادت سے ہونی چاہئے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو پسند نہ فرمایا اس لئے کہ اس میں نصاریٰ کے ساتھ تشبہ ہے کہ ان کی تاریخ حضرت عیسیٰ کی ولادت باسعادت سے ہے۔ بعض نے یہ رائے دی کہ آپ کی وفات سے تاریخ مقرر کی جائے، اس کو بھی حضرت نے ناپسند فرمایا اس لئے کہ آپ کی حادثہ کبریٰ اور مصیبۃ عظمیٰ ہے اس سے تاریخ کی ابتدأ مناسب نہیں۔ بحث وتمحیص کے بعد سب کا اتفاق اس پر ہوا کہ ہجرت سے

تاریخ مقرر ہونی چاہئے۔ فاروق اعظم نے اسی رائے کو پسند کیا اس لئے کہ ہجرت ہی سے حق اور باطل کا فرق واضح ہوا۔ شعائر اسلام یعنی جمعہ اور عیدین علی الاعلان ادا کیے گئے۔ (شرح السیر الکبیر)

غرض دنیا کے تمام اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اجماع ہے کہ سن ہجری کا پہلا مہینہ ماہِ محرم الحرام ہے اور اس کی ابتداء خلیفۂ راشدِ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانہ سے اور حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اجماع سے ہوئی۔ بعد کے خلفاءِ راشدین نے اس کو بغیر ترمیم کے جاری رکھا۔ یہ سنِ ہجری اسلامی کیلنڈر رہے۔

لیکن کچھ حضرات جو کہ خلفاء راشدین کی سنت کو سنت اور اسلامی فعل نہیں مانتے ان کا خیال ہے کہ سنِ ہجری کی ابتداء حضور اکرم ﷺ کے زمانہ ہی سے ہوئی اور اس سلسلہ میں وہ حضرات جو دلیل دیتے ہیں وہ دلیل خود ان کے اصول سے نا قابلِ قبول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ''امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اسی روز (جس روز حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے) سے تاریخ اسلامی کی ابتداء رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ہوئی چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ربیع الاول سے تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔ اس روایت کو امام حاکم کی اِکلیل میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ روایت معضل ہے۔ (معضل روایت اس روایت کو کہتے ہیں جس میں درمیان سند سے دو متوالی راویوں کو چھوڑ دیا جائے)۔ ان حضرات کی دلیل دو وجہوں سے نا قابل قبول ہے۔ (۱) ان کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف ''صحیح حدیث پر عمل کرتے ہیں، بلکہ مرسل حدیث کو بھی حجت نہیں مانتے، پھر معضل حدیث کیسے ان کی دلیل ہو سکتی ہے۔ (۲) ان کی پیش کردہ معضل حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ربیع الاول سے تاریخ لکھنے کا حکم دیا، جبکہ رائج سنِ ہجری کا پہلا مہینہ ماہِ محرم الحرام ہے۔

اس کے بالمقابل جمیع اہل سنت والجماعت جو سنِ ہجری کو دور فاروقی سے تسلیم کرتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

عملِ متوارَث: سنِ ہجری یعنی اسلامی کیلنڈر دور فاروقی سے بطور توارث اور تعامل منقول ہونے والا عمل بھی ہے۔ درج ذیل آیات کریمہ عملِ متوارَث کی اہمیت ونزاکت کو بتا رہی ہیں جن سے صَرف نظر ممکن ہی نہیں ہے۔

(۱) وَعَدَ اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض الآیة
ترجمہ:۔ تم میں جولوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو ان کیلئے پسند فرمایا ہے اس کو ان کیلئے قوت دے گا، اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بہ امن کردیگا۔
(سورہ نور آیت نمبر ۵۵)

(۲) الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰة واٰتوُ الزکٰوة وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکرِ، وللّٰہ عاقبة الامور. ترجمہ:۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں) کو بھی نیک کاموں کے کرنے کو کہیں، اور برے کاموں سے منع کریں، اور سب کاموں کا اختیار تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ (سورہ حج آیت نمبر ۴۱)

ان آیتوں میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ خلفائے راشدین نے جمیع بلاد اسلامیہ میں مختلف پہلوؤں سے نفاذ شریعت کے سلسلہ میں جو محنتیں کی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہیں، ان کے زمانے میں جس کسی مسئلہ پر عملاً یا قولاً اتفاق ہوگیا، خواہ وہ کسی ایک اسلامی شہر یا ملک کا اتفاق ہو یا پوری خلافت اسلامیہ کا مجموعی طور پر اتفاق ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمکین کے مرادف ہیں۔ ان آیات کی یہ تفسیر ومفہوم بہت سی تفسیر کی کتابوں میں ہے، مثلاً تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص ۴۳۶، تفسیر بحرمحیط ج ۶ ص ۴۸، تفسیر بیضاوی ج ۴ ص ۱۲۹، تفسیر کشاف ج ۳ ص ۱۶۲ وغیرہ۔ لہٰذا عہد خلافت راشدہ کے اجماعی مسائل کی خلاف ورزی ہرگز جائز نہیں ہوگی، چنانچہ تراویح کی بیس رکعات، ایک مجلس کی تین طلاقوں کا تین شمار ہونا، نکاح متعہ کی حرمت، جمعہ کی اذان اوّل کا اضافہ، عورتوں کو مسجد میں جانے سے ممانعت، قرآن کریم کو ایک صحیفہ میں جمع کرنا، یا مصحف عثمانی ہی کا سب کو پابند کیا جانا وغیرہ، یہ سب امور خیر محض ہیں۔

حضور ﷺ کی حدیث: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت اختلاف دیکھے گا پس میری سنّت اور خلفائے راشدین کی سنّت کو لازم پکڑنا جو کہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اسے خوب مضبوطی سے پکڑے رہو۔'' (ابوداؤد ص ۱۹۵ ج ۲۔ ترمذی ص ۹۰

ج ۲۔ ابن ماجہ ص ۵)۔ ''تم پر لازم ہے میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت'' کے تحت اسی طرح سنِ ہجری کا رائج ہونا سنت ہے، خیر محض ہے اور یہ اسلامی کیلنڈر ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے خلفاءِ راشدین کے طریقہ کو بھی سنت کہا ہے۔ مزید یہ کہ اس پر صحابہ کا اجماع بھی ہوگیا۔

سن ہجری کی خصوصیات

سن ہجری کا اگر دوسرے رائج سنوات سے موازنہ کیا جائے تو درجِ ذیل خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) سن ہجری سب سے قدیم ہے اور دوسرے رائج سنوات کی تدوین اس کے بعد ہوئی ہے۔ (۲) سن ہجری ترمیمات سے پاک ہے۔ (۳) تمام سنوات کی ابتداء قمری مہینوں سے ہوئی بعد میں انہیں شمسی مہینوں میں تبدیل کر دیا گیا، لیکن سنہ ہجری از اول تا آخر قمری مہینوں ہی پر مشتمل ہے۔ (۴) دیگر سنوات چونکہ شمسی مہینوں کے حساب سے ہیں اسلئے اُن کے تہوار اور اہم ایام مقررہ موسم میں ہی آتے ہیں، جب کہ سنہ ہجری کے لحاظ سے تہوار اور اہم ایام ہر موسم میں ہوتے ہیں۔ (۵) سنہ ہجری میں بارہ مہینے مقرر ہیں جو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قانون کے مطابق ہے اور دیگر سنوات میں سے اکثر کے سال کے مہینوں کی تعداد میں ردوبدل ہوتے رہتا ہے یعنی ترمیم ہوتی رہتی ہے، جبکہ سنہ ہجری کے مہینوں کی تعداد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (۶) سنہ ہجری دنیاوی رسم ورواج سے پاک ہے۔ اکثر سنوات کسی شخص کی پیدائش یا موت سے شروع ہوتے ہیں یا کوئی اہم آسمانی، سلطانی حادثات سے شروع ہوتے ہیں، لیکن سنہ ہجری اللہ رب العزت کے اہم حکم ''ہجرت'' سے شروع ہوتا ہے۔ (۷) دیگر سنوات میں دنوں اور مہینوں کے نام دیوی دیوتاؤں یا ستاروں وغیرہ کے نام سے موسوم ہوتے ہیں، لیکن سنہ ہجری میں مہینوں کے نام: (۱) محرم (۲) صفر (۳) ربیع الاول (۴) ربیع الآخر (۵) جمادی الاولیٰ (۶) جمادی الاخریٰ (۷) رجب (۸) شعبان (۹) رمضان (۱۰) شوال (۱۱) ذی القعدہ (۱۲) ذی الحجہ ہیں۔ اور دنوں کے نام: (۱) جمعہ (۲) یوم السبت (۳) یوم الاحد (۴) یوم الاثنین (۵) یوم الثلاثہ (۶) یوم الاربعہ (۷) یوم الخمیس ہیں۔

عورتوں کے لباس وآرائش کی حدود

مقالہ نگار: شیخ وہبی سلیمان غاوجی
نائب استاذ فقہ، شعبۂ دینیات، اسلامیہ کالج دبئی

ترجمہ: امداداللہ امیر الدین
مئوی، قاسمی

(قسط دوم)

عورت کا لباس:

عورت کے باہر نکلنے کے لباس میں چند امور شرط ہیں:

۱:- وہ لباس کشادہ ہو، پورے جسم کو اچھی طرح چھپانے والا ہو۔

۲:- موٹا اور دبیز ہو کہ اندر کے اعضاء نظر نہ آئیں، کیونکہ باریک کپڑوں سے ستر ممکن نہیں ہوتا، بلکہ دبیز کپڑا لازم ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: کہ میں نے دو قسم کے جہنمی دیکھے: ایک تو وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دم کی طرح کوڑے ہوں گے جن سے لوگوں کو ماریں گے، دوسرے وہ عورتیں جو کپڑا پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی، مائل کرنے والی اور فریفتہ ہونے والی ہوں گی، ان کے سروں پر بال بختی اونٹ کے کوہان کے مانند ہوں گے، ایسی عورتیں نہ جنت میں داخل ہوں گی نہ اس کی خوشبو انھیں میسر ہوگی، حالانکہ جنت کی خوشبو تو لمبے فاصلے سے بھی محسوس ہو جائے گی۔ (مسلم: ۱۸۶/۶، واحمد: ۳۵۶/۲)

حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے ارشاد ''کاسیات عاریات'' سے آپ ﷺ کی مراد وہ عورتیں ہیں جو باریک جھلک دار کپڑے پہنتی ہیں جن سے ستر کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، یہ عورتیں نام کی ملبوس اور حقیقت میں عریاں ہوتی ہیں، خود حق سے روگرداں اور اپنے خاوندوں کی ضلالت کا سبب بنتی ہیں۔[1]

۳:- وہ لباس اتنا تنگ نہ ہو کہ جسم یا اس کا کوئی حصہ واضح ہو، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی یہ بات پہنچی ہے کہ آپ عورتوں کو قباطی پہننے سے منع فرماتے تھے، یہ

(۱) (التمہید: ۲۰۴/۱۳)

قباطی اعضاء کو آشکارا تو نہیں کرتا مگر نشیب وفراز کو واضح کرتا ہے، کیونکہ تنگ لباس اندر کے اعضاء کو عیاں، اور عورت کے کندھے و سینے وغیرہ کے نشیب وفراز کو اجاگر کردیتا ہے[1]۔ اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس طرح کے تنگ وچست لباس جو جسم کے زیر وبم اور اعضاء کی تفصیلات آشکارا کرتے ہیں، وہ برانگیختگی کا سامان، اشتعال کا ذریعہ اور فتنے کا سبب ہوتے ہیں، خواہ عورت کا ایسا ارادہ ہو یا نہ ہو۔

۴:- شہرت ونا موری کا لباس نہ ہو، دکتور عبدالکریم زیدان کہتے ہیں کہ ہم شہرت کا لباس ایسے کپڑے کو قرار دے سکتے ہیں کہ جس کو زیب تن کرنے والا دوسروں سے رنگ یا بناوٹ کی بنا پر الگ محسوس ہو، لوگوں کی توجہ اور نگاہیں اپنی جانب کھینچے، اور پہننے والا خود پسندی وتکبر کا شکار ہوجائے۔ (المفصل فی احکام المرأۃ: ۳/۳۳۵)

۵:- عورت کا لباس مردوں کے لباس جیسا نہ ہو، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں، اور مردوں کی روش اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے[2]، اور ان ہی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجڑوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے، اور فرمایا کہ ان کو اپنے گھروں سے باہر نکال دو، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فلاں کو دربدر کیا تھا۔ (بخاری: ۵۸۸۶)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ لباسوں کی ساخت اور بناوٹ علاقوں کی عادات اور چلن کے ساتھ مختلف ہوتی رہتی ہے، بعض ایسی بھی قومیں ہیں جن میں مرد وعورت کا لباس الگ الگ نہیں ہوتا، وہاں پردے اور حجاب کے ذریعہ عورتیں ممتاز ہوتی ہیں۔ (فتح الباری: ۱۰/۳۳۲)

۶:- ایسا لباس نہ ہو جو ہمارے دیار کی کافر عورتوں کا امتیاز ہوتا ہے، تاکہ یہ امر کافروں کی پسند ناپسند میں مشابہت کا باعث نہ ہوجائے جو کہ خلافِ شرع امر ہے، اور یہ مشابہت بسا اوقات ان کافروں کے باطل عقائد ورسوم کی تحسین کا سبب ہوجاتی ہے، حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو شخص جس قوم کی روِش اختیار کرے گا اس کا شمار ان ہی میں ہوگا۔ (ابوداؤد: ۴۰۳۱)

۷:- گھر سے نکلتے وقت جسم یا کپڑے معطر نہ ہوں، کیونکہ اس سلسلے میں مشہور احادیث وارد ہیں۔

---

(۱) (المدخل لابن الحاج: ۱/۲۴۳) (۲) بخاری: ۵۸۸۵

عورت کا ستر:

گھر کے اندر کا ستر وحجاب: زوجین کے مابین کسی طرح کا کوئی پردہ نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض اعضاء کا دیکھنا شرعاً پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ بنا پردہ کے غسل کرنا بھی ناپسندیدہ امر ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ باحیا پردہ دار ہے، جب تم میں سے کوئی غسل کرے تو اسے پردہ کر لینا چاہئے۔

مَحرم مرد وعورت، اگر چہ وہ باپ، بھائی یا بہن ہوں، ان کے سامنے عورت کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے کے درمیان کا حصہ ہے، اس لیے ان لوگوں کے سامنے تنگ و چست لباس پہننے میں کوئی حرج نہیں، اِلا یہ کہ مَحرم مردوں سے فتنہ کا اندیشہ ہو، البتہ اگر لباس ایسا ہو کہ ناف سے گھٹنے کے درمیان کا حصہ عیاں ہو رہا ہو جیسے پتلون ہوتا ہے، تو ایسا لباس عورت کے لیے مکروہ یا حرام ہوگا، کیونکہ اس میں عورت کا مکمل ستر نظر آتا ہے، اور لوگ اس میں غفلت برتتے ہیں، اسی طرح اگر لباس اتنا باریک ہو کہ ناف کے اوپر کے اعضاء کو ظاہر کر رہا ہو تو یہ بھی فتنہ برپا کرنے کا سبب ہوتا ہے، لہٰذا شوہر کے علاوہ کسی کو بھی ضرورتِ شرعی کے بغیر یہ حق نہیں پہنچتا کہ عورت کے ناف سے گھٹنے کے درمیانی حصہ پر نظر ڈالے۔ (دیکھئے آیتِ کریمہ: لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ (سورۃ نور کی تفسیر)

عورت کی آرائش:

پروفیسر مہد یہ زمیلی لکھتی ہیں کہ عورت کے لیے چہرہ پر سرخی لگانا، پاؤڈر مَلنا، انگلیاں رنگنا[1]، اور مختلف رنگوں وغیرہ سے زینت اختیار کرنا مباح ہے، اس سے ممانعت کی کوئی نص نہیں ہے، نہ ہی یہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کے حکم میں داخل ہے، کیونکہ یہ وقتی تبدیلی ہوتی ہے، پانی سے دھل کر زائل ہو جاتی ہے، اس لیے مباح ہے، نیز لکھتی ہیں اللہ کے فرمان: ''ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها'' میں زینت سے تین چیزیں مراد ہیں:

ا:-ابرو کو وسمہ سے رنگنا اور خضاب کرنا، رخساروں پر سرخی لگانا اور ہاتھوں پیروں میں منہدی لگانا۔

۲:-زیورات، مثلاً انگوٹھی، کنگن، پازیب، بازوبند، گلے کا ہار، سر کا تاج، کمر بند، اور کانوں کی بالیاں۔

(ا) یہ خیال رہے کہ ناخن کے اوپر رنگ کی کوئی تہہ نہ چڑھے جو وضوء اور غسل میں پانی کو ناخن تک نہ پہنچنے دے، ورنہ وہ جائز نہیں ہوگا۔

۳:-عورت کے کپڑے۔ (لباس المرأة وزينتها:ص۱۵۷-۱۶۶)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ خضاب، رنگ، تعویذات، بالیوں، پازیب، سونے کی انگوٹھی اور باریک کپڑوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو فرمایا کہ اے جماعتِ خواتین! تم سب کا معاملہ ایک عورت کا معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے زینت کو مباح قرار دیا ہے، البتہ تم لوگ ان مردوں کے روبرو بے پردہ نہ جاؤ جن کے لیے تمھارے کسی عضو محرم کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ (تفسیر قرطبی:۳۱/۱۲)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ آیت کریمہ:''ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولىٰ''کے تحت لکھتے ہیں: پھر معلوم ہونا چاہئے کہ میرے نزدیک جس زینت کا اظہار ممنوع ہے اس کے ساتھ وہ کپڑے بھی لاحق ہیں جو ہمارے زمانے کی مال دار عورتیں اپنے کپڑوں کے اوپر پہنتی اور گھر سے نکلتے وقت بطور پردہ استعمال کرتی ہیں، وہ رنگ برنگے ریشمی لباس ہوتے ہیں، جن پر جاذب نظر سیم وزر کے نقش ونگار ہوتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ شوہروں اور دیگر گھر کے ذمہ دار مردوں کا عورتوں کو ایسے کپڑے میں باہر نکلنے اور غیر مردوں کے درمیان آمد ورفت کی اجازت دینا ان کی بے غیرتی کا غماز ہے، اور اس میں ابتلاء عام ہو چکا ہے۔ (روح المعانی:۱۴۶/۱۸)

اللہ جل شانہ اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جو کہ دراصل تمام ایمان والیوں کو خطاب ہے: کہ اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو اور جاہلیت کے طریقے پر گھر سے نہ نکلو (سورہ احزاب ۳۳) حضرت مجاہد بن جبر تابعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ چلتی تھیں، اسی کو تبرج الجاهلية کہا گیا ہے، اور حضرت مقاتل سے مروی ہے کہ تبرج یہ ہے کہ عورت سر پر دوپٹہ اس طرح نہ ڈالے اور لپیٹے کہ اس کے ہار، بالیاں اور گردن وغیرہ چھپ جائیں، بلکہ سب دِکھتا رہے۔[۱] راقم کہتا ہے کہ عورتوں کے سلسلے میں کل اور آج میں کس قدر یکسانیت ہوگئی کہ کل کی طرح آج بھی عورتیں پورے سر یا کچھ حصے پر اسکارف ڈال لیتی ہیں، اور ان کی گردن، سینہ، بازو، پنڈلی، جسم کا رنگ اور خدوخال سب نظر آتا رہتا ہے، اور وہ سمجھتی ہیں کہ وہ باپردہ ہیں، معاذ اللہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'' اَوَمَنۡ يُّنَشَّؤُا فِى الۡحِلۡيَةِ وَهُوَ فِى الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ ''(کیا جو کہ آرائش میں نشو ونما پائے اور وہ مباحثہ میں قوتِ بیانیہ نہ رکھے۔(سورہ زخرف ۱۸) ڈاکٹر عبد الکریم

(۱) تفسیر بغوی:۲۵۸/۵۔

زیدان لکھتے ہیں: کہ اسلام فطری دین ہے، اس لیے اس کا کوئی حکم فطرت کے خلاف نہیں ہوسکتا، اس کے تمام تر احکامات وتشریعات فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور مناسبت رکھتے ہیں، بلکہ فطرت خود ان تشریعات کی متقاضی ہے، چنانچہ عورت کے لیے اظہارِ زینت کی اباحت فطرت کی چاہت ہے، ہر صنفِ نازک کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ خوبصورت ہو اور خوبصورت ترین نظر آئے، اور زمانے کے لحاظ سے اسبابِ زینت میں تبدیلی آتی رہتی ہے، مگر فطرت میں راسخ اس کی وجہ اور بنیاد ایک ہی ہوتی ہے اور وہ حسن کی تحصیل یا تکمیل ہے، اسلام نے اس فطری تقاضے کو ختم نہیں کیا، بلکہ اس کو منظّم اور مرتب کردیا، اور عورت کو پابند کردیا کہ وہ صرف ایک مرد یعنی اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز بن کر رہے، وہ اس کی تمام حرکتوں پر نظر رکھے، کسی غیر کی وہاں تک قطعاً رسائی نہ ہو۔

چنانچہ اپنے شوہر کے لیے عورت کا زینت اختیار کرنا پسندیدہ عمل ہے، اور اگر شوہر تقاضا کرے تو واجب ہوجاتا ہے، اور ترکِ زینت پر شوہر کو تعزیر کا حق ہوتا ہے، اور شوہر کے لیے بیوی کے سجنے سنورنے کی مصلحت بالکل واضح ہے کہ عورت شوہر کی نگاہ میں بھلی لگے، اسے یہ احساس دلائے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اسی کے لیے سجتی سنورتی ہے، اس طرح کی اداؤں سے زوجین کے مابین الفت ومحبت قائم رہتی ہے، اور ان کے درمیان الفت ومحبت کا قائم ودائم رہنا شریعت کا مقصد ہے، اسلامی مقاصد سے واقف کوئی مسلمان عورت اس مقصد سے غفلت نہیں کرسکتی، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں شوہر کے لیے بناؤ سنگار کرتی ہے، صرف باہر نکلنے اور دوسروں سے ملنے جلنے تک اپنے میک اَپ کو محدود نہیں رکھتی، وہ شوہر کی کوئی جائز خواہش کسی صورت میں رد نہیں کرتی چاہے وہ اپنی کسی مخصوص ضرورت میں مشغول کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی شوہر کے لیے بھی مستحب ہے کہ اپنی بیوی کے لیے زینت اختیار کرے، تاکہ یہ چیز دونوں کو غیر مرد وعورت سے اللہ کی حلال کردہ اشیاء میں بے نیازی کا سبب بنے۔

(فی ظلال القرآن للشہید سید قطب: ۵۹/۱۸)

الف: عورت کی زیبائش کی شکلیں:

حَلْيٌ کی جمع حُلِيٌّ ہے، بمعنی سونے چاندی وغیرہ کے زیورات جن سے عورت مزین ہوتی ہے، سونے چاندی کے زیورات کے سلسلے میں حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ریشمی لباس اور سونا میری امت کے مردوں کے لیے حرام ہے اور عورتوں کے لیے حلال ہے (جامع ترمذی ۱۷۲۰) شارح ترمذی لکھتے ہیں: کہ سونے سے مراد سونے کے زیورات ہیں، اسی طرح چاندی کے زیور بھی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، سوائے ان کے جن کا مردوں کے لیے استثناء کر دیا گیا ہے، مثلاً چاندی کی انگوٹھی وغیرہ (۱)۔

ڈاکٹر زیدان لکھتے ہیں کہ عورتوں کے لیے سونے چاندی کی وہ تمام چیزیں مباح ہیں جو وہ عادۃً پہنتی ہیں، جیسے کنگن، پازیب، بالیاں، انگوٹھی اور وہ چیزیں بھی جو وہ اپنے چہرے، گردن، یا ہاتھ پیر، اور کانوں میں پہنتی ہیں۔ رہی بات ان زیوروں کی جو عورتیں عموماً نہیں پہنتی ہیں، جیسے پیٹی اور اس جیسے مردانہ زیورات، تو یہ عورتوں کے لیے درست نہیں ہیں (۲)۔ اور عورتوں کے لیے سونے چاندی کے صرف زیورات مباح ہیں، کھانے پینے کے برتنوں میں ان کا استعمال درست نہیں ہے، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص سیم وزر کے برتنوں میں پانی پیتا ہے، وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیل رہا ہے۔ (مسلم: ۲۰۶۵) اسی طرح سونے چاندی کے ظروف سے تیل لگانا، خوشبو لگانا، یا جیسے سرمہ دانی، آئینہ، قلم، دوات وغیرہ کے طور پر استعمال کرنا بھی حرام ہے جب کہ ان ظروف کو ابتداءً ان ہی کاموں کے لیے بنایا گیا ہو، جیسا کہ در مختار میں صراحت ہے۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں: اس حکم میں سونے چاندی سے بنے ظروف میں کھانے پینے، طہارت حاصل کرنے یا ان کے چمچ سے کھانے، یا ان سے بنی انگیٹھی میں دھونی دینے اور ان سے بنے برتن میں پیشاب کرنے کی حرمت شامل ہے، اور اس زینت اور ان کے استعمال کرنے کی حرمت میں مرد و عورت کے مابین کوئی فرق نہیں ہے، البتہ شوہر کی خاطر سامانِ زینت اختیار کرنے میں دونوں کے درمیان فرق ہے۔ (۳) علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں سونے چاندی سے بنے کھانے پینے وغیرہ استعمال کے ظروف کے مرد و عورت دونوں پر حرام ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ (المجموع: ۱/۲۴۸) راقم کہتا ہے کہ: ''سبل السلام'' (۱/۲۸) میں علامہ صنعانی نے لکھا ہے کہ اجماع کا دعویٰ درست نہیں

(۱) عارضۃ الاحوذی لابن العربی: ۵/۳۸۳، (۲) ایضاً ص ۳۵۰

(۳) زرقانی علی موطاء: ۲۹۲۴

ہے، یہ حدیث نبوی کے الفاظ کو غیر حدیث سے بدلنے کے مرادف ہے، کیوں کہ حدیث میں صرف کھانے پینے کی حرمت کا تذکرہ ہے، مگر فقہاء نے اس مفہوم کو استعمالی اشیاء سے بدل دیا، الفاظِ حدیث کو ترک کرکے اپنی جانب سے ایک عام لفظ اختیار کرلیا، اس طرح کی بہت سی نظیریں فقہاء کی عبارات میں موجود ہیں، اھ۔ علامہ صنعانی کا یہ قول اجماع اور ائمۂ اربعہ کے متفق علیہ مسئلے کی مخالفت ہے، بلکہ یہ ان حضرات کی بے ادبی کے مماثل ہے، اور اس طرح کی حرکتیں ''سبل السلام'' وغیرہ میں ان سے سرزد ہوئی ہیں۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ کے حالات میں رقم طراز ہیں: کہ جس امر پر ائمۂ اربعہ نے اتفاق کرلیا، اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا، باوجودے کہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ان حضرات کا کسی مسئلہ پر متفق ہوجانا اجماعِ امت نہیں کہلائے گا، البتہ ان کے کسی متفق علیہ فیصلے کے بارے میں یہ کہتے ہوئے خوف آتا ہے کہ حق اس کے خلاف ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۷)

سونا چاندی، خواہ وہ انگوٹھی کی شکل میں ہوں یا کنگن کی، اگر وہ بقدر نصاب ہوں تو مسلمان بالغہ عورت پر ان کی زکوٰۃ واجب ہے، چنانچہ ترمذی شریف میں عمرو بن شعیب عن اُبیہ کی سند سے روایت مذکور ہے کہ ایک عورت اپنی لڑکی کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں، اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے دو موٹے کنگن تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کہ کیا تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ اس نے نفی میں جواب دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تمھیں اچھا لگے گا کہ ان کنگنوں کے بدلے بروز قیامت اللہ تعالیٰ تمھیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ سن کر اس نے دونوں کنگن اتار کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کردیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔ یہ روایت مسند احمد: ۶۶۶۷، سنن ابی داؤد: ۱۵۶۳، اور دارقطنی: ۲/۱۰۸ میں بھی ہے۔

ریاض افتاء کمیٹی کے ایک رکن شیخ اسماعیل انصاری کا جسم سے ملحق وغیر ملحق ہر طرح کے زیور سے عورت کی تزئین کاری کی اباحت کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں انھوں نے اپنے ایک معاصر کے اِس خیال کی تردید کی ہے کہ عورت کے لیے جسم سے اتصال رکھنے والے سونے کے زیور سے آراستگی حرام ہے، اس کا یہ خیال جمہور کے مخالف ہے، شیخ علی طنطاوی اپنے فتاویٰ ۱/۱۵۹ میں لکھتے ہیں: کہ جسم سے متصل سونے کے زیور والی حدیث کے منسوخ ہونے کے قائل حافظ ابن حجر

عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں انھوں نے فتح الباری میں اس کی صراحت کی ہے، اھ۔ راقم کہتا ہے کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابن حجر سے پہلے یہ نسخ کا قول نقل کیا ہے، اور مجھے نہیں لگتا کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ شیخ ناصر البانی حافظ ابن حجر سے بڑے عالمِ حدیث ہیں، جب کہ وہی فقہاء کرام کا بھی قول ہے، اور چاروں مذاہب اس پر متفق ہیں کہ عورت کے لیے متصل غیر متصل ہر قسم کے سونے کے زیورات سے مزین ہونا جائز اور مباح ہے، اگر شیخ ناصر کے لیے اجتہادی خطا کا عذر مان لیا جائے تو ان لوگوں کے لیے کیا عذر ہوسکتا ہے جو ان کے متبعین ہیں، جنھوں نے جماعت فقہاء اور محققین ائمۂ حدیث کو پسِ پشت ڈال دیا ہے؟ کیا ان کے لیے بہتر نہیں کہ جماعت کے ساتھ شاہراہِ عام پر چلیں اور اس راستے پر نہ چلیں جس پر چلنے والا صرف ایک شخص ہے؟ دین خیر خواہی سے عبارت ہے، اس لیے میں شیخ ناصر سے امید کرتا ہوں کہ وہ فروعی مسائل میں اپنے شخصی اجتہادات کے ذریعہ مسلمانوں کی جماعت میں انتشار نہیں پھیلائیں گے، اور الحاد وکفر وایمان کے اصل معرکوں سے ہٹا کر ان غیر معروف میدانوں کی جانب امت کی توجہ پھیرنے کا سبب نہیں بنیں گے الخ۔

(دیکھیے التعلیق المیسر علی ملتقی الأبحر: ۲/۲۳۳)

مرد کی طرح عورت کے لیے بھی سونے کے علاوہ موتی، یاقوت اور زمرد سے آراستگی درست ہے، اور چاندی سے بھی جب کہ وہ استعمال کے قبیل سے نہ ہو، لہذا عورت کے لیے چمچ، پلیٹ یا کپ وغیرہ میں چاندی کا استعمال درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ اصلاً استعمال کرنا ہے، اور مزین ہونا اس کے تابع ہے (ردالمحتار: ۵/۲۶۱)

ب: سرمہ اور خضاب:

کحل اس چیز کو کہتے ہیں جس کا سرمہ لگائیں، اور سرمہ وہ چیز ہے جو شفایابی کے مقصد سے آنکھوں میں لگائی جاتی ہے، انتہائی باریک پاؤڈر جو آنکھوں میں رکھا جاتا ہے، جو آنکھ کو سیاہی عطا کرتا ہے، سرمہ لگانا عورت کے لیے درست ہے، کیونکہ یہ مرد و عورت کے لیے مباح زینت کی قبیل سے ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ جو شخص سرمہ لگائے اسے طاق عدد کی رعایت کرنی چاہئے، جو ایسا کرے تو بہت اچھا ہے، اور نہ کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (ابن ماجہ: ۳۴۹۸)

اور خضاب اس شے کو کہتے ہیں جس سے رنگا جائے، مثلاً منہدی سے رنگنے پر اختضب

بالحناء ، اور کسی چیز کے رنگ کو سرخی، زردی وغیرہ میں بدل دینے پر أخضب الشيئ اور خضبه کہا جاتا ہے، حاصل یہ کہ خضاب اس چیز کا نام ہے، جس سے کلر کیا جاتا ہے، اور کسی چیز کے رنگ کو سرخی یا زردی وغیرہ سے بدلا جاتا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ خدمت نبویٰ میں لائے گئے، ان کے سر کے بال ثغامہ گھاس کی مانند سفید تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس سفیدی کو کسی چیز سے بدل ڈالو، البتہ سیاہ رنگ سے بچے رہنا۔ (ثغامہ سفید پھولوں والی ایک گھاس کا نام ہے) (شرح نووی علی مسلم: ۱۴/۷۹)

نیز امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہود و نصاریٰ اپنے بالوں میں خضاب نہیں کرتے، تم ان کی مخالفت کرو۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دونوں حدیثیں نقل کر کے لکھتے ہیں: ہمارا مذہب یہ ہے کہ مرد و عورت کے لیے سفید بالوں میں سرخ یا زرد خضاب کرنا مستحب ہے، اور سیاہ خضاب صحیح ترین اور راجح قول کے مطابق حرام ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی ہے، مگر حرمت کا قول مختار ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم لوگ سیاہ رنگ کے خضاب سے دور رہو''۔ (شرح نووی: ۱۴/۸۰)

بعض معاصرین نے بیوی کے لیے سیاہ خضاب کو مباح قرار دیا ہے، خواہ یہ خضاب بالوں کا رنگ تبدیل کرنے کے لیے ہو یا ان کی سفیدی دور کرنے کے لیے، اور وجہ یہ لکھی ہے ہ بیوی کے معاملے میں کوئی دھوکہ یا فریب نہیں ہے، کیوں کہ شوہر بیوی اور اس کی عمر کو اچھی طرح جانتا ہوتا ہے، یہ خضاب تو محض تحصیلِ زینت کے لیے کرتی ہے، چنانچہ ''المغنی'' میں ہے: کہ امام اسحاق نے سیاہ خضاب کے مسئلے میں عورت کو رخصت دی ہے۔ تاکہ وہ اس طرح اپنے شوہر کے لیے زینت اختیار کرے اھ(۱)۔ عورت کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں رنگنا درست ہے، اور عورتوں کی مشابہت کی بناء پر مردوں کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہے، اِلا یہ کہ رنگنے کی کوئی ضرورتِ شدیدہ ہو۔

ج: عورت کے کپڑے:

کپڑوں کے انتخاب میں اصل یہ ہے کہ وہ سترِ عورت، ٹھنڈک کے دفعیہ، موسمِ گرما میں خوش

(۱) المغنی: ۱/۹۲، تفصیل کے لیے دیکھیے ''المفصل فی احکام لامرأۃ'': ۳/۳۵۷، اور رد المحتار: ۵/۲۷۱

گواری کا باعث اور زینت کا ذریعہ ہوتے ہیں، اور یہ سب جائز امور ہیں، مزید یہ کہ عورت کے لیے ریشمی لباس پہننا، اس سے رومال اور دیگر سامانِ زینت بنانا درست ہے، جس طرح عورت کو مختلف رنگوں سفید، سرخ، زرد، سبز وغیرہ کے کپڑے پہننا مباح ہے، شوہر کے سامنے کپڑوں میں یا بدون کپڑے، اور محارم کے روبرو ستر واجب کے ساتھ آنے کی اجازت ہے، البتہ اجنبیوں کے ساتھ اندیشۂ فتنہ کی بناء پر بھڑک دار کپڑے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور حجاب شرعی کی شروط پر تفصیلی کلام ماقبل میں گذر چکا ہے۔

اسی طرح مرد وعورت کے کپڑوں پر صلیب وغیرہ کا فرانہ شعار کا ہونا درست نہیں ہے، حضرت عمران بن حطان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر جس چیز پر بھی صلیب بنی ہوتی اس کو توڑے بنا نہیں چھوڑتے تھے، (۱) حضرت عبدالرحمٰن بن اذینہ کی والدہ دفرہ بیان کرتی ہیں کہ ہم ام المؤمنین کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہی تھیں کہ ان کی نظر ایک عورت کی چادر پر پڑی جس پر صلیب بنی تھی، ام المؤمنین نے کہا اس کو پھینک دو، اس کو پھینک دو، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس جیسی چیز کو دیکھتے تو اسے قطع کر دیتے تھے۔ (۲) اور حضرت عبداللہ بن عون حضرت محمد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ کے پاس صلیب بنا ہوا پردہ دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قطع کرنے کا حکم دیا۔ (۳) لہذا اسلام کے پیروکاروں کو لازم ہے کہ کپڑوں، چیزوں اور پوسٹروں واشتہارات سے صلیب وغیرہ کو ہٹائیں کیوں کہ یہ ایسا قابلِ نکیر امر ہے جس کا ازالہ ضروری ہے، عورت مرد اور بچے کسی کے کپڑوں میں ذی روح انسان یا جانور کی تصویر کا ہونا درست نہیں ہے، نہ ہی پردوں اور نشست گاہوں میں جائز ہے، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں (رحمت کے) فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ (۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے واپس تشریف لائے، میں نے ایک دیوار پر تصویر دار پردہ ڈال رکھا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے

---

(۱) البخاری مع فتح الباری ۱۰/۳۸۵، واحمد: ۶/۵۲ (۲) مسند احمد: ۶/۱۴۰

(۳) ابن ابی شیبہ: ۸/۱۹۸ (۴) یہ حدیث صحیحین میں متعدد مواقع پر مذکور ہے۔

پھاڑ دیا، اور فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔" فرماتی ہیں کہ ہم نے اس کپڑے کے ایک یا دو تکیے بنا دیے۔[۱] علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس تصویر کے گھر میں رہنے سے اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، اس سے مراد ایسی تصویر ہے جس کا بنانا حرام ہے، اور وہ ذی روح کی تصاویر ہیں جن کا سر قطع نہ کیا گیا ہو، نہ ہی مواقعِ ذلت میں استعمال ہوں[۲]۔

د: بالوں کی دیکھ بھال:

ابوداؤد شریف میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے بال رکھے ہوں اس کو ان کی دیکھ ریکھ کرنی چاہیے۔ اس حدیث کی بنا پر دھلائی، صفائی کنگھی کر کے اور تیل ڈال کر بالوں کی دیکھ بھال کرنا عورت کے لیے مستحب ہے، اور یہ تمام امور عندالشرع پسندیدہ اور بالوں کی عزت کے قبیل سے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم لوگ حجۃ الوداع کے سال عمرے کا احرام باندھ کر اللہ کے رسول ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جس کے ساتھ ہدی کا جانور ہے وہ عمرے کے ساتھ حج کا بھی احرام باندھ لے، اور وہ اس وقت احرام سے نکلے گا جب دونوں کو ادا کر لے"، فرماتی ہیں کہ میں حالتِ حیض میں مکہ مکرمہ آئی، میں نے نہ بیت اللہ کا طواف کیا، نہ صفا مروہ کی سعی کی، میں نے آپ ﷺ سے اس کا شکوہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سر کے بال کھول ڈالو، کنگھی کر لو، اور عمرہ چھوڑ کر حج کا احرام باندھ لو"، الحدیث[۳]، نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کثرت سے سر میں تیل لگاتے اور داڑھی میں کنگھی فرماتے تھے[۴]۔ البتہ مرد و عورت سب کے لیے سفید بال اکھاڑنا مکروہ ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: "سفید بالوں کو نہ اکھاڑو، کیونکہ جس مسلمان کا بھی حالتِ اسلام میں بال سفید ہوگا، کل قیامت میں یہ بال اس کے لیے نور ہوگا"۔ (ابوداؤد مع عون المعبود: ۱۱/۲۵۶)

شوہر کے لیے مزین ہونے کے مقصد سے شادی شدہ عورت کے لیے چہرے کے بال مونڈنا، دور کرنا درست ہے، کیونکہ یہاں دھوکہ اور فریب نہیں ہے۔

(جاری ہے)

---

(۱) بخاری مع فتح: ۱۰/۳۸۶، و مسلم مع شرح نووی: ۱۴/۸۸
(۲) فتح الباری: ۱۰/۳۸۲
(۳) مسلم مع شرح نووی: ۴/۳۹۴
(۴) شرح شمائل ترمذی، مصنفہ استاذ عبدالجواد دومی: ص ۴۲

علامہ خالد رومی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ
اور
موجودہ ترکی وصدر طیب اردگان حفظہ اللہ

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

آپ سلیمانیہ کے قریب قصبہ قرہ داغ کے رہنے والے تھے، ۱۱۹۵ھ میں ولادت ہوئی، اساتذۂ وقت سے علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی اور معقولات، ریاضیات، ہیئت وغیرہ میں بھی کمال پیدا کیا، پھر سلیمانیہ واپس آکر حکمت، علم کلام وبلاغت کی انتہائی کتابیں پڑھائیں۔

(تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص۳۷۰)

علمی کمالات:

آپ مشہور ومعروف عالم تھے، ہر فن میں استعداد کامل حاصل تھی، حدیث کی پچاس کتابوں کی سند رکھتے تھے، علماء ہندوستان میں بس حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مداح تھے، ان کے اشعار فارسی وعربی فردوسی وفرزدق سے سبقت لے گئے تھے، حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ ان کے اشعار کو عارف جامی کے اشعار سے مشابہ قرار دیتے تھے۔ قصائد عربی وفارسی جن کو آپ نے اپنے پیر ومرشد کی مدح میں نظم کیا ہے خسرو وجامی کے ان منظومات سے کم نہیں کہے جاسکتے جو انھوں نے اپنے اپنے زمانے میں حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں نظم کیے ہیں۔

(قافلہ اہل دل ص۲۴۴)

شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱) کی خدمت میں:

۱۲۲۰ھ میں حج بیت اللہ وزیارت سے مشرف ہوئے، مکہ معظّمہ میں دہلی جانے کا اشارہ غیبی پایا، پہلے شام واپس آئے وہاں ایک ہندوستانی مرزا رحیم اللہ بیگ جو کہ جہاں گشت سیاح اور شاہ غلام

(۱) آپ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ سید نور محمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کو خواجہ سیف الدین سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت حاصل تھی اور وہ اپنے والد محترم محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید اور خلیفہ اعظم ہیں۔

علی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ ملاقات ہوئی، آپ نے ان سے مرشد نہ ملنے کی شکایت کی، مرزا رحیم اللہ بیگ کی حسن دلالت سے ۱۲۲۴ھ میں ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے پورے ایک سال کی مدت میں دہلی پہنچے، دہلی پہنچ کر عربی قصیدہ شوقیہ کہا جس کا مطلع ہے ۔

کملت مُسَافَةُ کَعْبَةِ الامالِ　　　حَمدًا لِمَنْ قد منّ بالا کمالِ

ترجمہ: (قبلۂ آرزو وامید (دہلی) تک پہنچنے کی مسافت تمام ہوئی، شکر اس پاک ذات کا جس نے اپنے کرم سے اتمام کی توفیق دی)

آپ نے اپنے پیر ومرشد کی شان میں ایک اعلیٰ درجہ کا قصیدۂ فارسیہ لکھا ہے جس کے اول وآخر اشعار یہ ہیں ۔

دہیداز من خبر آں شاہ خوباں را بہ پنہانی　　　کہ عالم زندہ شد بار دگر از ابرنیسانی

ز جام فیض خود کن خالد درماندہ را سیراب　　　کہ او لب تشنہ مستسقی وتو دریائے احسانی

(تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص ۳۷۱-۳۷۰، قافلہ اہل دل ص ۲۴۶)

یہ انسٹھ شعر کا قصیدہ ہے جو شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے پورا نقل کیا ہے۔

خانقاہ میں قیام:

آپ ۹ مہینے شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے، خانقاہ کی آب کشی (کنویں سے پانی کھینچنا) کی خدمت اپنے ذمہ لی، محفل مبارک میں صف نعال کے اندر گردن جھکا کر بیٹھتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں آپ کے روبرو نامناسب الفاظ کہے، آپ نے اس بُرا کہنے والے شخص کو بصورت خنزیر دیکھا، اس واقعہ سے آپ کا اعتقاد حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اور زیادہ ہوگیا۔

(قافلہ اہل دل ص ۲۴۴)

آپ کی یکسوئی:

خانقاہ میں قیام کے دوران آپ کی یکسوئی کا عالم یہ تھا کہ دہلی کے علماء ومشائخ جو ان کے فضل وکمال کی شہرت برسوں سے سنتے تھے ملنے آتے تو فرمادیتے کہ فقیر جس مقصد کے لیے آیا ہے، اس کے حصول کے بغیر کسی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، مسند وقت سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آئے کہ اَلْقَادِمُ یُزَارُ (باہر سے آنے والے سے خود ملنے جاتے ہیں) اور شاہ ابوسعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو ان کے شاگرد رشید تھے، عرض کیا کہ استاذ الہند آپ کی ملاقات کے لیے

آئے ہیں۔فرمایا کہ سلام کہواور کہو کہ مقصد براری کے بعد خود حاضر ہوں گا۔

(تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص۳۶۹)

اجازت وخلافت:

حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی طرف عنایت بسیار مبذول فرمائی، ایک سال نہیں گذرا تھا کہ طرق خمسہ میں اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، بوقت رخصت حضرت شیخ محمد عابد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار تک چل کر ان کو وداع کہا، کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بوقت رخصت آپ کو ''بشارت قطبیت آں دیار'' دی تھی۔جس وقت وہاں پہنچے بہت زیادہ ریاضتیں کی، ہجوم خلق اتنا ہوا کہ گویا اس دیار کی سلطنت ان سے متعلق ہوگئی ہے۔ (قافلہ اہل دل ص۲۴۵)

قبولیت ورجوع عام:

بغداد پہنچ کر تربیت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا، پانچ مہینے وہاں قیام کر کے وطن واپس ہوئے، وہاں ان کی قبولیت اور رجوع عام دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوا اور ان کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کیا گیا، والی بغداد سعید پاشا کی طرف سے بعض علماء کو اس کی تردید کا ایما ہوا، علماء بغداد نے اپنی مہروں سے مزین کر کے ان کی براءت اور ان کے عالی مرتبہ ہونے کا فتویٰ دیا۔کردوں، اہل کرکوک، اربل، موصل، عمادیہ، عنیتاب، حلب، شام، مدینہ منورہ، مکہ معظّمہ اور بغداد کے ہزاروں آدمیوں نے ان سے نفع اٹھایا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت حصہ۴، ص۳۷۱)

مولانا شاہ رؤوف احمد صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب دُرُّ المعارف میں جمعہ ۲۴/رجب ۱۲۳۱ھ کی روداد میں لکھتے ہیں کہ: ایک مغربی بزرگ حضرت (شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ) کا نام مبارک سن کر منزلوں پر منزلیں قطع کر کے بغداد میں مولانا خالد رومی سے ملتے ہوئے حاضر ہوئے، انھوں نے مولانا کی مقبولیت اور مرجعیت کا حال بیان کیا کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی حلقہ بگوش ارادت اور بیعت سے مشرف ہو چکے ہیں، ایک ہزار عالم متبحر داخل طریق ہو کر مولانا کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔(ایضاً ص۳۶۹) شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نقل کرتا تھا کہ آپ کے گھوڑے شبہ کا چارہ نہیں کھاتے تھے، کرامات بسیار آپ سے ظاہر ہوئیں۔اس دیار کے رئیسوں کو آپ نگاہ میں نہیں لاتے تھے۔کہتے ہیں کہ والی بغداد کو اپنی مجلس سے غصہ ہو کر نکال دیا تھا۔

(قافلۂ اہل دل ص۲۴۵)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا مخالفین کا رد:

صاحب رد المختار علامہ محمد امین بن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ کے نہ صرف مرید بلکہ شاگرد بھی تھے جیسا کہ رسالہ ''المجد التالد فی مناقب الشیخ خالد'' ص ۱۷۰ سے ظاہر ہے۔ (قافلہ اہل دل ص ۲۴۸)

انھوں نے ان کے مناقب میں پورا رسالہ ''سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی'' کے نام سے تصنیف کیا ہے، جو اصلاً ایک رسالہ کی تردید میں ہے جو بعض حاسدین نے مولانا خالد رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت وتضلیل میں لکھا تھا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت حصہ ۴ ص ۳۷۰)

وفات:

آخر میں مولانا خالد رحمۃ اللہ علیہ نے شام کو اپنا مستقر بنالیا۔ انھوں نے ۱۲۳۸ھ میں اپنے خلفاء ومریدین کے ایک جم غفیر کے ساتھ شام کا سفر فرمایا اور ملک شام گویا ان پر اُمڈ آیا، سلوک وارشاد کے ساتھ علوم شرعیہ کی اشاعت۔ مساجد کی دوبارہ آبادی ورونق کی طرف بھی متوجہ رہے۔ بالآخر ۱۲۴۲ھ کے طاعون میں ۱۴؍ ذی القعدہ کو شہادت حاصل کی اور قاسیون کے دامن میں مدفون ہوئے۔

(ایضاً ص ۳۷۲-۳۷۱)

کہتے ہیں کہ انھوں نے چار آدمیوں کو اپنی جگہ پر متعاقباً یعنی یکے بعد دیگرے مقرر کیا تھا کہ میرے بعد فلاں اور اس کے بعد فلاں، چاروں شخص طاعون کے اندر پے در پے اسی ترتیب سے وفات پاگئے۔ (قافلۂ اہل دل ص ۲۴۷)

آپ کی خانقاہ کُردستان (ایران) میں بمقام درود مبارک موجود ہے۔ (ایضاً ص ۲۴۷)

مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

مولانا کا سلسلہ شام وترکی میں اب تک موجود ہے، میں نے دمشق وحلب اور ترکی میں اس سلسلے کے متعدد مشائخ کبار کی زیارت کی ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت حصہ ۴ ص ۳۷۲)

ترکی اور تصوف:

حنفیت اور تصوف ترکوں کے رگ وپے میں پیوست ہے۔

(سفرنامہ ترکی از مولانا عیسی منصوری ص ۲۵)

ترکی میں کل حنفی اور کل کے کل نقشبندی ہیں۔ (ترک ناداں سے ترک دانا تک ص ۵۵)

اہل تصوف کا عظیم الشان کارنامہ:

آج کل تصوف کا انکار اور استہزاء ایک فیشن بن گیا ہے، مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وسط ایشیاء میں کمیونزم کی کالی آندھی یا اتاترک کے جبر واستبداد کے طوفان کے سخت حالات میں ان قوموں کو صرف تصوف ہی نے اسلام پر قائم رکھا، حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ تصوف کے سلسلے نہ ہوتے تو اندلس کی طرح ترکی سے بھی اسلام ختم ہوگیا ہوتا۔ خانقاہوں نے اتاترک کے استبدادی دور میں بھی زیر زمین دینی واخلاقی رہنمائی جاری رکھی، ان سلاسل تصوف کے مشائخ نے اخلاقی، سماجی، تعلیمی میدانوں میں رہنمائی کی اور مثالی تعلیمی ادارے، اسلامی ہوسٹل، کارخانے نشر واشاعت کے ادارے اور کمپنیاں قائم کیں، نقشبندی سلسلے کے رہنما شیخ سعید کردی اور ان کے دوسو کے قریب مریدین شہادت سے سرفراز ہوئے، ہزاروں گھر منہدم کیے گئے۔ آٹھویں دہائی میں جب نجم الدین اربکان نے بیت المقدس کی بازیابی کے لیے ریلی نکالی تو اتاترک کی فوج نے تین ہزار سے زیادہ لوگوں کو تختہ دار پر چڑھا دیا اور بے شمار لوگوں کو جیل میں ٹھونس دیا، پھر ۱۹۸۰ء میں ایک لاکھ تیس ہزار لوگوں کو جن میں بہت بڑی تعداد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تھی، دینی ذہن رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا، انھیں ملازمت سے نکال دیا گیا، جن میں استنبول وانقرہ یونیورسٹیوں اور دیگر کالجوں کے پروفیسروں کی بڑی تعداد شامل تھی، لیکن نورسی، نقشبندی، سلیمانیہ سلسلے برابر اپنا کام کرتے۔

(سفر نامہ ترکی از مولانا عیسی منصوری ص ۲۲-۲۱)

شیخ محمود آفندی:

ترکی جو خلافت کی بلندی سے سیکولرزم کی پستی میں چلا گیا تھا، نقشبندی سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ محمود آفندی حفظہ اللہ سے اللہ نے تجدید واحیاء دین کا کام لیا، آپ ترکی کے مشہور بزرگ حضرت علی حیدر اخسخوی کے خلیفہ ہیں جو حضرت علی رضا البزار رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں تھے، یہ سلسلہ آگے جاکر حضرت مولانا خالد نقشبندی قدس سرہ سے جاملتا ہے، آپ کے شیخ کا تعلق جارجیا اور شام کی طرف واقع ترکی کے مشرقی علاقے سے تھا، آپ ان کے مشورہ سے سرحدی علاقہ سے اٹھ کر مرکزی شہر استنبول تشریف لے آئے۔ (ترک ناداں ....ص ۱۳-۱۲-۱۱)

شیخ آفندی کے محلّہ کی دینی حالت کے چشم دید گواہ مولانا عیسیٰ منصوری تحریر فرماتے ہیں:

اس محلّہ میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوا کہ گویا صدیوں پرانے دور کے خالص خانقاہی ماحول

میں آ گئے ہیں، لوگوں کا لباس، حلیہ سب ہی متشرع، خواتین بلکہ بچیاں تک پورے حجاب میں استنبول کے اس محلّہ کی مسجد اوپر سے نیچے تک پوری طرح بھری ہوئی تھی اور تمام مصلّٰی پوری ڈاڑھی اور شرعی لباس میں تھے۔ بندہ چشم تصور میں صدیوں پرانے دور میں پہنچ گیا، جب ترکی میں اسلام کا غلبہ تھا اور ترکوں نے اسلام کا پرچم اٹھایا ہوا تھا۔ (سفرنامہ ترکی ص ۲۵)

طیب اردگان حفظہ اللہ:

ترکی کی موجودہ حکمراں جماعت کی مقبولیت اس کے قائد طیب اردگان کی وجہ سے ہے جن کی ولادت ۲۶ فروری ۱۹۵۴ء کو استنبول کے یورپی حصہ کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام احمد اور والدہ کا نام تنزیلہ تھا۔ ان کے والد محترم محنت مزدوری کرتے تھے۔

تعلیم:

انھوں نے تعلیم کا آغاز ۱۹۶۵ء میں قاسم پاشا قبیلے کے لڑکوں کے ساتھ کیا، اسکول کی تعلیم کے بعد انھوں نے ائمہ وخطباء کی تربیت گاہ میں داخلہ لیا، اپنے پاکیزہ مزاج اور دینی رجحان کی وجہ سے جلد ہی یہ مقام حاصل کر لیا کہ ان کے استاد صاحب نے چھوٹی عمر کے باوجود ان کو دیگر طلبہ کو نماز سکھانے پر مقرر کر دیا۔ نوعمری ہی میں ان کی دینی پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ انھوں نے ایسی جگہ نماز پڑھنے سے انکار کر دیا، جہاں ان کے سامنے بے پردہ خواتین کی تصویروں والا اخبار اور رسالہ تھا۔ ان کے استاد صاحب کو جب ان کی یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے حیرت آمیز خوشی کا اظہار کیا۔ دینی پختگی کے اپنے ان جیسے کاموں کی وجہ سے ان کو ائمہ اور مبلغین کی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی ''شیخ'' کے لقب سے نوازا گیا اور اس نصاب کی تکمیل کے بعد وہ امام المبلغین کہلائے۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسہ آقصری میں بزنس ایڈمنسٹریشن، معاشیات اور علوم تجارت کی تعلیم حاصل کی، آج کل یہ مدرسہ مرمرہ یونیورسٹی کی ''معاشیات اور انتظامی امور کی فیکلٹی'' سے موسوم ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے ۱۹۷۰ء میں فوج میں ایک ریزرو آفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس اثناء میں فوجی خدمات بہت شاندار طریقے سے انجام دیں، اس کے بعد انھوں نے بعض مالیاتی اداروں اور نجی کمپنیوں میں بطور ڈائریکٹر اپنی انتظامی صلاحیتوں کا قابل تعریف اظہار کیا۔ (ترک ناداں ....ص ۱۸۶-۱۸۵)

سلسلہ بیعت:

طیب اردگان خالدی سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں جو ان کے

سیاسی رہنما نجم الدین اربکان کے بھی شیخ تھے اس وقت شیخ محمود آفندی سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ترکی اور وسط ایشیا میں زیادہ تر نقشبندی سلسلے کی خالدی شاخ نے کام کیا ہے۔

(سفر نامہ ترکی از مولانا عیسی منصوری ص ۲۱)

دینداری و اخلاق:

طیب اردگان شروع ہی سے ایمانی پختگی رکھتے ہیں، اسلامی اخلاق پر کاربند اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے پابند ہیں۔وہ اس قدر مذہبی رجحان ومیلان رکھتے ہیں کہ انھوں نے شادی کے بعد سب سے پہلے اپنی بیوی کے ساتھ حج کیا۔تہجد گذار اور شب زندہ دار ہیں۔محنت مزدوری سے عار نہیں، وہ تعلیم کے دوران ہی اپنے والد کے ساتھ گھر کے اور اپنے بھائیوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے استنبول کی سڑکوں کے کنارے لیموں کا شربت، تربوز اور کیک بیچتے تھے۔ان کی ذاتی اور خاندانی زندگی بہت ہی سادہ ہے، وہ عالم اسلام کے ایک ایسے منفرد حکمراں ہیں جو عوام میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔رمضان المبارک میں افطار کے وقت عوامی مقامات میں عام لوگوں کے ساتھ افطار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔وزیر اعظم ہونے کے باوجود اپنے افراد خانہ کے ساتھ ایک عام فلیٹ میں رہتے ہیں۔غیر ملک میں کوئی سرمایہ ہے نہ کوئی جائداد۔ (ترک ناداں......ص ۱۸۷-۱۸۶)

عزیمت و تعلق مع اللہ:

طیب اردگان جب استنبول کے میئر تھے اس وقت ایک عوامی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ترکی شاعر ضیاء غوک الپ کے اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے ؎

مساجد ہماری بیرکیں ہیں گنبد ہمارا ہیلمٹ ہے
مینارے ہمارے نیزے ہیں نمازی ہمارے لشکر ہیں
یہ وہ مقدس فوج ہے جو اپنے دین کی حفاظت کرتی ہے

ان اشعار کے پڑھنے پر ان کو جیل کی سزا ہوئی۔گھر والوں سے خوشی اور استقامت کے ساتھ رخصت ہوئے، جمعہ کا دن تھا، انھوں نے جامع مسجد سلطان فاتح میں نماز جمعہ ادا کی اور جیل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے لوگوں سے یوں خطاب کیا:

اے میرے پیارو! میں تمھیں الوداع کہتا ہوں، صرف استنبول کے لیے نہیں اپنے ملک ترکی بلکہ عالم اسلام کو روشن صبح کا پیغام دیتا ہوں اور اس پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔تم سے درخواست کرتا

ہوں کہ تم آزمائش کی اس گھڑی میں مخلوق سے احتجاج کرنے اور اس سے مدد مانگنے کے بجائے اپنے رب کے حضور گریہ وزاری کرو۔ اپنے جذبات کا بے ہنگم استعمال کرنے کے بجائے ان کا آئندہ انتخاب میں بھرپور اور فیصلہ کن اظہار کرو۔ (ترک ناداں............ص۱۸۹)

دینی غیرت واسلامی حمیت:

سوئزرلینڈ کے شہر ڈیوس میں ہونے والے ورلڈ اکنامک فورم کے اجلاس میں اسرائیل کے صدر شمعون پیریز نے اپنی ۲۵ منٹ کی تقریر میں کہا کہ اسرائیل کو غزہ میں کیے گئے قتل عام پر کوئی شرمندگی نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو مستقبل میں بھی وہ اس طرح کے اقدام سے گریز نہیں کرے گا۔ اسرائیلی صدر کی وحشیانہ اقدام اور درندگی کے اعلان پر مشتمل اس متکبرانہ تقریر کا جواب دینے کے لیے اس اجلاس میں موجود ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردگان نے منتظمین سے وقت مانگا۔ منتظمین کے انکار پر وہ اجلاس سے یہ کہتے ہوئے واک آوٹ کر گئے کہ وہ اس اجلاس میں آئندہ کبھی شریک نہیں ہوں گے۔ (ایضاً ص۱۹۵)

فریڈم فلوٹیلا:

۳۱؍مئی ۲۰۱۰ء کو اسرائیل کی وحشیانہ جارحیت اور درندگی کے شکار غزہ کے محصور مظلوم مسلمانوں کے لیے غازی یلدرم کی قیادت میں امداد لے کر جانے والے جہاز فریڈم فلوٹیلا پر اسرائیل نے حملہ کیا جس کے نتیجہ میں ترکی کے ۹ رضا کار شہید اور ۱۹ زخمی ہوئے۔ ترک وزیر اعظم نے اسرائیل کے اس حملہ کی شدید مذمت کرتے ہوئے انسانی ضمیر پر حملے سے تعبیر کیا اور احتجاج اور ردعمل کے طور پر اسرائیل سے اپنے سفیر کو واپس بلالیا اور اسرائیل کے سفیر کو ترکی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اسرائیل سے فوجی تعاون کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے اسرائیلی طیاروں کو ترکی کی فضائی حدود استعمال کرنے سے روک دیا۔ اقوام متحدہ کی ۵۶ صفحات کی فریڈم فلوٹیلا پر حملے سے متعلق رپورٹ کو خلاف حقیقت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ اسرائیل اپنے اس سفاکانہ عمل پر ترکی سے معافی مانگے اور زرتلافی ادا کرے۔ (ترک ناداں......ص۱۹۷-۱۹۶)

چنانچہ ۶ سال کے سفارتی تعطل کے بعد جون ۲۰۱۶ء میں ترکی سے اسرائیل نے معافی مانگی اور زرتاوان ادا کیا جس کے بعد سفارتی تعلقات بحال ہوئے۔

(انقلاب ص۱۲، ۱۱؍مئی ۲۰۱۷ء)

صومالیہ اور برمی مسلمانوں کی مدد:

صومالیہ کے قحط اور بھکمری کا مسئلہ ایک بین الاقوامی اِشو بنا ہوا ہے، مسلم ملکوں کی طرف سے بھی امداد جاتی ہے مگر عیسائی خیراتی اور فلاحی اداروں اور ریڈکراس کے ذریعہ سے ہوکر، ۲۵ سال کے بعد رجب طیب اردگان پہلے پرائم منسٹر ہیں جنھوں نے صومالیہ میں رمضان گذارا اور وہاں ہسپتال تعمیر کیے، تعلیم کا انتظام کیا، نہ صرف مسلمانوں کی مدد کی، بلکہ عیسائیوں کو بھی امداد پہنچائی، امریکہ تیس سال سے صومالیہ کی مدد میں پیش پیش رہا اور اپنے کو ہیرو بنا کر پیش کرتا رہا مگر ترکی نے ایک ہی سال میں صومالیہ کا نقشہ بدل دیا اور لوگوں کے دل جیت لیے، صومالیہ میں طیب اردگان کے اکثر چاہنے والے عیسائی ہیں۔ (سفرنامہ ترکی ص۴۰)

حالیہ دنوں میں برمی مسلمانوں پر خوں آشام ظلم اور ہولناک ستم ڈھایا گیا، قتل وخوں ریزی اور بربریت کا ننگا ناچ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، ایسے نازک موقع پر طیب اردگان ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود اعلیٰ حکومتی وفد کے ہمراہ برما پہنچ کر وہاں کے مسلمانوں کے غم میں شریک ہوئے، انھیں تسلی دی، ان کی اہلیہ آمنہ اردگان بھی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے لٹے پٹے مظلوم مسلمانوں کی بپتا سنی ان کے آنسو پونچھے اور انھیں تسلی دی ان کی مدد کی، مستقبل میں بھی ترکی کی بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ (ایضاً ص۴۱)

اراکین حکومت کی دینداری:

الناس علی دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے طور طریق پر ہوتے ہیں) کے مطابق ملک میں مذہبی رجحانات کا یہ عالم ہے کہ اس وقت حکومت کے کم وبیش تمام اراکین صرف پانچ وقت کے نماز کے پابند نہیں، بلکہ تہجد گذار بھی ہیں۔ (ترک ناداں.....ص۱۹۳)

بہت سے اعلیٰ سیاسی عہدیدار پنج وقتہ نماز کے ساتھ نقشبندی سلسلے کے تمام اذکار واشغال پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ (ایضاً ص۳۱)

اندازِ تربیت:

اپریل ۲۰۱۷ء میں ترکی میں یوم اطفال کے موقع پر صدر طیب اردگان نے ان بچوں کو ایک ایک سائیکل بطور انعام دی جنھوں نے بلا ناغہ چالیس دن تک فجر کی نماز با جماعت پڑھی تھی۔ مندرجہ ذیل آیت پر کتنے خوبصورت انداز میں عمل ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِيْ الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ.

(ترجمہ: یہ لوگ ایسے ہیں اگر زمین میں ان کو حکومت عطا فرمائیں تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور بھلے کاموں کا حکم کریں گے، برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں گے اور تمام کاموں کا آخری انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔(پارہ ۱۷ سورۃ الحج آیت نمبر ۴۱)

حجۃ الاسلام کانفرنس:

صدر طیب اردگان نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ کی حیات وخدمات کے اعتراف میں ایک بین الاقوامی اجتماع کروایا جو دنیا کی کسی بھی حکومت کی طرف سے اپنی نوعیت کا منفرد اور شاید واحد اقدام ہے۔ (ترک ناداں.....ص ۳۵)

مسلم ممالک کے عظیم اتحاد کی ضرورت اور طیب اردگان:

پروفیسر اختر الواسع تحریر فرماتے ہیں:

گذشتہ دنوں اپنے ہندوستان دورہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ترکی کے صدر رجب طیب اردگان نے بڑے ہی دل سوز انداز میں مسلم ممالک کے اتحاد کی بات کہی تھی، ان کا اشارہ ایسے گرینڈ اتحاد کی جانب تھا جو عالمی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے اور دنیا کو بتا سکے کہ اسلام کے ماننے والے پُر امن بقائے باہم کے تحت خیر سگالی اور ترقی کے علمبردار ہیں۔ (سہارا، گورکھپور ۱۰ر جون ۲۰۱۷ء)

۵ر جون ۲۰۱۷ء کو آل سعود کی تحریک پر سعودی سمیت مصر، متحدہ عرب امارات، اور بحرین نے قطر سے تعلق رکھنے والے دسیوں افراد اور گروپوں کو دہشت گرد قرار دے کر قطر سے سفارتی، تجارتی اور سیاسی تعلقات توڑ دیے۔

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے

طیب اردگان نے سعودی حکومت کو غیرت دلاتے ہوئے کہا:

اگر خود کو خادم حرمین شریفین کہتے ہو تو اس پر عمل کر کے بھی دکھاؤ نہ کہ ایک برادر ملک سے اپنی دشمنی نکالو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مشکل کی اس گھڑی میں وہ پوری طاقت سے قطر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ (انقلاب ۱۱ر جون ۲۰۱۷ء ص ۶)

یہی نہیں بلکہ انھوں نے پارلیامنٹ کی ہنگامی اجلاس کے بعد قطر میں کسی بھی خطرے سے نپٹنے کے لیے ترک فوجیوں کو بھیج دیا اور غذائی قلت سے بچنے کے لیے کھانے پینے کی اشیاء سے بھرے

ہوئے کئی جہاز قطر روانہ کردیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسرائیل، امریکہ اور ناسمجھ مسلم ممالک کی قطر کو برباد کرنے کی گھناونی سازش ناکام ہوگئی۔ جب سعودی سمیت دیگر خلیجی ممالک نے ۱۳ مطالبات قطر کو پیش کیےتو قطر نے اس کو مسترد کردیا۔صدر طیب اردگان نے کہا:

ترکی نہیں چاہتا کہ خطہ کسی دوسرے بحران کا شکار ہو، خلیجی ممالک کو باہمی اختلافات بات چیت کے ذریعہ ختم کرنا ہوں گے شام اور عراق کے بحران کافی ہیں، ابھی تک ہم ان بحرانوں سے نہیں نپٹ سکے ہیں، خلیجی ممالک میں کوئی اور بحران مسلمان دشمنوں کے مفاد میں ہوگا۔انھوں نے سعودی فرماں روا شاہ سلمان بن عبدالعزیز سے بار بار کہا کہ وہ بڑے بھائی کا کردار نبھائیں، بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیجی بحران کو حل کرنے کے لیے مداخلت کریں۔

(انقلاب ۷؍جولائی ۲۰۱۷ء ص ۱۷)

ناکام فوجی بغاوت کی پہلی سالانہ تقریب پر ترکی کی قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے طیب اردگان نے کہا:

ترک قوم نے ۱۵؍جولائی کو فوج کی شکل میں منظّم ہونے والے باغی ٹولے کے خلاف ایمان کی طاقت اور نہتے ہاتھوں جنگ کی، جس کی دنیا بھر میں کوئی نظیر نہیں ملتی، میں اس قوم کا حصہ اور اس وطن کی اولاد ہونے پر اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر ادا کرتا ہوں۔ (انقلاب ۲۰؍جولائی ۲۰۱۷ء)

ترکی سربراہ نے بغاوت کی ناکامی کی جو بنیاد بیان کی وہ ''ایمان'' اور ''نہتے ہاتھوں'' کی طاقت ہے۔ یہ باتیں مسلم حکمراں طبقہ اور عالم اسلام کو غور و فکر کی دعوت دے رہی ہیں۔

اس وقت دنیا کے اسٹیج پر امت مسلمہ کی طرف سے قیادت کا رول اگر کوئی شخصیت ادا کررہی ہےتو وہ یہی طیب اردگان ہیں۔آج کے مایوس کن حالات میں آپ کی ذات گرامی امت مسلمہ کے لیے ''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی'' کی حیثیت رکھتی ہے، امید ہے کہ ضرور ایک دن وہ آئے گا کہ ترکی کا یہ مردمجاہد اور صاحب ہمت وعزیمت انسان اپنے عثمانی اجداد کی تاریخ کو دہرائے گا، اور امت مسلمہ کی کھوئی ہوئی آبرو بحال کرکے دم لے گا اور دنیا اسے اپنا رہبر اور مثالی قائد تسلیم کرے گی، خدا کرے وہ دن آئے کہ ہم علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مصرع ذرا ترمیم کے ساتھ یوں پڑھیں:

'رفو' کردی ترک 'دانا' نے خلافت کی قبا

وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز اِنَّ اللہ لطیف لما یشاء

کتب خانۂ حضرت محدث الاعظمی

کے بارے میں ایک اہم تاثر

محدث کبیر اعظمی رحمۃ اللہ کا کتب خانہ یاد آ گیا:

بات ذاتی کتب خانوں کی آئی تو محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن محدث الاعظمی رحمۃ اللہ کا کتب خانہ یاد آ گیا، اس بوریا نشیں مرد فقیر نے کس طرح اتنا عظیم الشان کتب خانہ بنایا سمجھ میں نہیں آتا، اسلامیات کا محقق اس ذخیرۂ کتب کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے، ہر علم وفن کی کتابوں کا نادر وکمیاب ذخیرہ ہے، بہت سے نایاب مخطوطات بھی ہیں، احادیث کے تعلق سے جو فنون ہیں ان کی بیش قیمت کتابیں حضرت محدث رحمۃ اللہ کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہیں، حضرت نے کتب احادیث کے تعلیقات وتحشیہ اور تصحیح کے جو عظیم علمی کارنامے انجام دیے ہیں، وہ اپنے ہی کتب خانے میں بیٹھ کر انجام دیے ہیں، علمی دنیا کو آج بھی حیرت ہے کہ گوشہ گمنامی میں بیٹھ کر اتنا عظیم کارنامہ کیسے انجام پذیر ہوا، اتنا کام تو اکیڈمی بھی نہیں کر سکتی، مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ نیز حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ کی کتاب الزہد کی تصحیح وتعلیق بے مثال علمی کارنامہ ہے، ان کے علاوہ کم وبیش ساٹھ حدیث کی کتابوں پر حضرت محدث رحمۃ اللہ کے تعلیقات ہیں، جو قابل صد ستائش ہیں، حضرت محدث رحمۃ اللہ کے صاحبزادگان گرامی حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب نے کتب خانہ کے لیے الگ عمارت تعمیر کر کے حضرت محدث رحمۃ اللہ کی کتابیں اس میں افادۂ عام کے لیے منتقل کر دی ہیں۔

﴿سوانح حضرت مرشدِ امتؒ (حضرت اقدس مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری نوراللہ مرقدہ) صفحہ ۴۹۵ مصنف حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب رحمانی﴾

ماخوذ

مسلم ممالک کتنے اسلامی ہیں؟

جارج واشنگٹن یونیورسٹی امریکہ کے ایک پروفیسر حسین عسکری کی تحقیق بعنوان ''مسلم ممالک کتنے اسلامی ہیں؟'' کے مطابق وہ تمام ممالک جو روزانہ کی زندگی میں ''اسلامی اصولوں'' کا نفاذ کرتے ہیں، وہ وہ نہیں ہیں جو روایتی طور پر مسلم ہیں، دنیا کے مختلف ممالک میں اگر درجہ بندی کی جائے تو مندرجہ ذیل نتیجہ نکلتا ہے۔ نیوزی لینڈ پہلے نمبر پر آتا ہے، لکسم برگ دوسرے پر اور آئر لینڈ تیسرے نمبر پر، آئس لینڈ چوتھے نمبر پر، فن لینڈ پانچویں پر اور ڈنمارک چھٹے نمبر پر، کینیڈا کا ساتواں نمبر ہے اور مسلم ممالک میں ملیشیا اڑتیسویں نمبر پر، کویت دس نمبر بعد اڑتالیسویں نمبر پر، بحرین چونسٹھویں نمبر پر اور سب کو متعجب کر دینے والا سلطنت سعودیہ عربیہ کو ایک سو اکتیسویں نمبر پر فائز کیا گیا ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ جو گلوبل اکونمی جرنل میں شائع ہوا تھا، ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو چونکا دینے والا ثابت ہوگا، لیکن جب ہم اپنے چاروں طرف دیکھیں تو ہمیں اس تحقیق سے حاصل نتائج سچے اور صحیح نظر آتے ہیں، مسلمان ہونے کے ناطے ہم عام طور سے مذہبی فرائض یا واجبات ادا کرنے کو کافی سمجھتے ہیں (نماز، روزہ، داڑھی، نقاب وغیرہ) تلاوت قرآن اور حدیث، لیکن ہم ان سب پر عمل نہیں کرتے جس کی ہم حمایت کرتے ہیں یا جس پر یقین رکھتے ہیں، ہم مذہبی اسباق یا وعظ اس دنیا کے رہنے والوں میں سب سے زیادہ سنتے ہیں لیکن ہم دنیا کی قوموں میں سب سے اچھی قوم نہیں ہیں، پچھلے ساٹھ برسوں میں ہم نے جمعہ کی نماز کے خطبے تین ہزار مرتبہ سنے ہیں۔

ایک چینی سوداگر نے ایک دفعہ کہا ''مسلم سوداگر آتے ہیں اور اپنے سامان پر بین الاقوامی لیبل اور برانڈ کی جھوٹی چپی لگانے کو کہتے ہیں لیکن جب میں ان کو کھانے کی دعوت دیتا ہوں تو منع کر دیتے ہیں کہ کھانا حلال نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جعلی سامان بیچنا ان کے لیے حلال ہے۔ ایک جاپانی مسلمان نے کہا ''میں نے مغربی ممالک کا سفر کیا اور غیر مسلموں کو روزانہ کی زندگی میں اسلام پر عمل کرتے دیکھا، میں مشرق وسطی میں سفر کیا، میں نے اسلام تو دیکھا لیکن مسلمان نظر نہیں آئے، میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے اسلام سے واقفیت تھی یہ جاننے سے پہلے کہ مسلمان کیسے عمل کرتے ہیں۔

(پروفیسر اطہر صدیقی، ماہ نامہ تہذیب الاخلاق)

(بشکریہ ماہنامہ ندائے حرم)